درِ پنہاں

(افسانے)

محمد شفیع ایاز

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

دردِ پنہاں

(مختصر افسانے)

دردِ پنہاں

(مختصر افسانے)

محمد شفیع ایاز

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

DARD-E-PINHAHAN

BY

MOHD.SHAFI AYAZ

1999

Rs 75/-

ISBN-81-86232-90-7

مصنف	محمد شفیع ایاز
ترتیب و تزئین	شعیب رضا
کمپوزنگ	کمرشیل کمپیوٹر سنٹر، دہلی۔۶
قیمت مجلد	۷۵ روپے
سنہ اشاعت	۱۹۹۹ء

MOHAMMAD SHAFI AYAZ

50, IQBALABAD. ANANTNAG, KASHMIR

Published by

Educational Publishing House

3108-Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan

Delhi-110006 Ph.: 7774965,526162

انتساب

ان معصوم، بے لوث، محبت سے سر شار
خوشبوئے آدمیت سے مملو دل نواز سانسوں کے نام
جنھیں دوستی کہتے ہیں
جب مجسم و متحرک تھیں تو جلیل ان کا نام تھا

جب
آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں تو
جلیل القدر بن گئیں
جلیلؔ!
جب اس عالم رنگ و بو کی زینت تھا
میرے قریب تھا
لیکن
عالم جاوِدانی کو سدھارنے
کے بعد اب
میرے قریب ترین ہے

"ایازؔ"

ترتیب

افسانے

”افسانوں کا افسانہ“

”درد پنہاں“ میرے ان اردو افسانوں کا ایک مختصر مجموعہ ہے جو
آج سے تقریباً بیس سال قبل زندگی کے اس خوبصورت اور حسین دور میں
معرض تحریر میں آئے، جب ہماری فراغت کے دن گورنمنٹ ڈگری کالج
اننت ناگ کے وسیع وعریض ماحول میں بسر ہو رہے تھے۔ ان کے ساتھ
بہت سی گراں قیمت یادیں وابستہ رہی ہیں۔ ان دنوں میری خواہش تھی کہ
اردو کے مایۂ ناز پروفیسر ڈاکٹر دُرّانی صاحب انھیں ایک نظر سے دیکھ لیں،
لیکن وقت گذرتے دیر نہیں لگتی ہے۔ اور پھر یہ بات ممکن نہیں ہو سکی۔

آج سے دو سال قبل جب میں جموں و کشمیر بینک کی بجبہارا برانچ
میں تبدیل ہو کر آیا ہوں، میرا رابطہ، محترم پروفیسر جی۔ ایم شاد صاحب سے
ہو گیا۔ وہ تو مجھے کالج کے زمانے سے ہی جانتے ہیں۔ انھوں نے اپنی مسلسل
نوازش سے میری حوصلہ افزائی کر کے، اردو ادب کی طرف از سر نو میری
توجہ پھیر دی۔ جب ہی میں ان اوراق پریشاں کو یکجا کرنے میں کامیاب
ہو سکا ہوں۔ میں محترم شاؔد صاحب کا نہایت ہی ممنون ہوں کہ انھوں نے نہ
صرف افسانوں کی نوک پلک درست کر لی اور انھیں زبان و ادب کی تہذیب
و تزئین سے آراستہ کیا، بلکہ میری گذارش پر اس مجموعے کا پیش لفظ بھی

تحریر فرمایا۔

"درد پنہاں" نام کے اس مجموعے میں جو افسانے شامل ہیں۔ وہ اپنی ابتدائی اصلی حالت ہی میں پیش کئے جارہے ہیں۔ زبان کی درستی، اور نوک پلک سنوارنے کے علاوہ ان میں کوئی تغیر و تبدیلی نہیں کیا گیا۔ اس کی صرف یہی وجہ ہے کہ میں ماضی کی ان معصوم اور حسین یادوں کو ان کی اپنی اصلی صورت ہی میں محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ میں اردو زبان و ادب کا طالب علم نہیں رہا ہوں لیکن اس پیاری زبان اور اس کے شعر و ادب کے ساتھ میرا شغف فطری اور موروثی ہے۔ اگرچہ میں اردو زبان کو ادبی لحاظ سے برتنے پر خاطر خواہ دسترس اور قدرت نہیں رکھتا ہوں۔ لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ گرامی قدر قارئین میری اس کوشش کی بھرپور پذیرائی فرمائیں گے۔

محمد شفیع ایازؔ

۵۰، اقبال آباد اننت ناگ کشمیر

۲۷ر مئی ۱۹۹۸ء

افسانۂ ایاز

ہر ملک کی اپنی روایات ہوتی ہیں جو اس کے مخصوص تہذیب وتمدن میں وجود میں آکر نشو ونما پائی ہیں۔ جس طرح قوموں کے آداب خورد ونوش، انداز معاشرت اور زندگی بسر کرنے کے الگ الگ طریقے ہوتے ہیں بالکل اسی طرح وہ اپنی ذہنی آسودگی اور روحانی سکون کے لئے اپنا مخصوص ادب بھی تخلیق کرتے ہیں۔ یہ کہنا سراسر زیادتی ہے کہ ہمارا ہندوستانی افسانوی ادب یورپ کا مرہون منت ہے۔ یورپ کے ہمہ گیر اور حیران کن سرعت کے ساتھ وقوع شدہ انقلاب اور ارتقاء سے بہت بہت پہلے ہمارے دیس میں اعلی پایہ کے ادبی، مذہبی اور فلسفیانہ شاہکار تحریر کئے گئے۔ ”ہتوپدیش“ کتھا سرت ساگر، پنچ تنتر ورہت کتھا، پراَن، وغیرہ نمایاں مقام رکھتے ہیں اور یہ اور دیگر شاہکار تراجم، اور مختلف صورتوں اور زبانوں میں نہ صرف یورپ بلکہ دنیا کے کونے کونے میں پہنچ گئے، کالی داس نے منظوم ڈرامے لکھے، جو اپنی تیکنیک، اعلیٰ فنی اسلوب اور مواد کی وجہ آج بھی قابل فخر کارنامے ہیں اسی طرح ہمارے ملک میں داستان گوئی اور کہانیاں تحریر کرنے کی روایات بھی قدیم ترین زمانے سے موجود ہیں۔ ان قدیم داستانوں میں ہمیں ایسے حصے اور ایسی بنیادیں بھی نظر آتی ہیں جنھیں کسی بھی

اعتبار سے مکمل افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے افسانہ اور کہانی لکھنا، شعر و شاعری کی طرح ہماری میراث ہے۔

ریاست جموں و کشمیر میں ابتدا ہی سے اردو زبان وادب سے شغف رکھنے والے لوگوں میں، طلباء اور اساتذہ کے علاوہ عام لوگ بھی شامل سمجھے جا سکتے ہیں۔ سب ہی اردو ادب کی تمام صنفوں، یعنی شعر و شاعری، افسانہ، ناول، داستان، وغیرہ کی کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور رکھتے ہیں۔ ہمارے عہد کے مانے جانے افسانہ نگاروں کو سب ہی بخوبی جانتے ہیں۔ جن میں پریم چند، محمد مجیب، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن، منٹو، انتظار حسین، کرشن چندر، مجنون گورکھپوری، اعظم کریوی، حامدی کشمیری، عصمت چغتائی، وغیرہ وغیرہ کی تخلیقات، سے بہت سے لوگ اچھی طرح سے شناسا ہیں۔ کیوں کہ ان لکھنے والوں کی گراں قدر تخلیقات ریاست کے نصاب تعلیم میں (آٹھویں جماعت سے لے کر ایم اے تک) شامل رہتی آئی ہیں اسی لئے اساتذہ کے علاوہ ہر نئی پود کے طلباء اور شائقین لازمی طور پر اپنے ہم عصر بزرگ لکھنے والوں کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔

نئے نئے لکھنے والے ان سے متاثر بھی ہوتے رہے اور منشی پریم چند اور اس جیسے لکھنے والے فنکار کسی خاص ازم یا دھارمک تعصب کے اور گروہ بندی کے نہ تو پرستار ہی تھے نہ پرچارک، اور پریم چند تو بلا مبالغہ ہمارے عہد کا مہان افسانہ نگار تھا جس کی تخلیقات سے اکثر نئے لکھنے والے کسی نہ کسی

صورت میں متاثر ہوتے رہے۔ اس قبیلہ کے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں نہ صرف اپنے دیس کی روایات کا خصوصی خیال رکھا، بلکہ وہ ہر لحاظ سے ہندوستانی تھے۔ انھوں نے اپنی تخلیقات سے معاشرے میں موجود سماجی، اخلاقی، معاشی برائیوں اور توہمات کی جکڑ بندیوں کی نشاندہی کی، اور مختلف مسائل کو اجاگر کیا اور ان کے خلاف لوگوں کو ابھارا۔ انہیں جہاں جہاں بھی برائیاں نظر آئیں، انہیں تنقید، اور طنز کا نشانہ بنایا، وہ محض تفنن طبع کے لئے نہیں، بلکہ مقصدیت کے تحت حقیقت کو آشکارا کرنے کے لئے لکھتے تھے۔ ایاز بھی انہی اساتذہ کا خوشہ چین ہے۔

محمد شفیع ایاز کو میں جب سے جانتا ہوں جب وہ گورنمنٹ ڈگری کالج کھنہ بل اننت ناگ میں بی ایس سی کا متعلم تھا۔ ایاز ان ایام میں لکھتا تھا اور ترقی وہوشمندی کے آثار اس کی لوح جبیں پر اسی وقت سے نمایاں طور پر محسوس ہوتے تھے۔ اس نے کشمیری زبان میں بہت ہی کم لکھا ہے، لیکن ادب کا باقاعدہ اور براہ راست طالب علم نہ ہوتے ہوئے بھی اس نے اُردو زبان کو ہی اپنے مافی الضمیر اور تخلیقات کے اظہار کا ذریعہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ پیش نظر مجموعے میں ایاز کے آٹھ مختصر افسانے شامل ہیں جو اس کے ایام کالج اور اس کے مابعد کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان ایام میں بھی باقی سب ہی ایسی جگہوں کی طرح کالج میں بھی گروہ بندیاں تھیں، کچھ آنجہانی اشتراکیت کے پرستار تھے، کچھ فرقہ پرستی کو ہوا دے رہے تھے اور کچھ

کر قسمکی رجعت پرستی کے اسیر تھے، ایاز ابتدا ہی سے نہ تو کسی ازم کے کھونٹے میں بندھا رہا۔ نہ ہی کسی گروہ بندی کا شکار ہوا۔ نہ ہی نظریاتی طور پر اور نہ ہی کسی مادی منفعت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس نے اپنا چولا بدلا ہے۔ وہ مشرقی اخلاق و روایات اور تہذیب و تمدن کا دلداہ تھا اور آج بھی ہے۔

ایاز کے افسانوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ فیشن کے طور پر اس میدان میں نہیں اترا ہے بلکہ وہ پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ، حقیقت نگاری کے لئے افسانے تراشتا ہے۔ اور وہ افسانوں کے کرداروں کے ذریعہ سے بھی دوسروں کو حقیقت سے روشناس کرنے کی کوشش کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ مختصر افسانے، اگرچہ اس کی ابتدائی تخلیقات ہیں لیکن پھر بھی ان میں ایک متوازن سوچ اور فکر ہے۔ ان کا بنیادی موضوع اور کردار انسان ہی ہے، چاہے وہ کسی بھی صورت، علامت یا کردار کے روپ میں پیش کیا گیا ہو۔ ایاز نے جزئیات نگاری، داخلی یا خارجی حقیقت نگاری کو جو افسانے کا اہم ترین حصہ ہے، برتنے کی حتی الوسع کوشش کی ہے۔ ان میں انسان کا دکھ درد کرب والم، اضطراب و غم، مسرت و خوشی، معاشرتی حالت سے پیدا شدہ جذبات، انسان کی تنہائی اور بے کسی و بے بسی کا کرب والم، سیاسی، سماجی اقتصادی اور معاشی پریشانیاں، سب ہی چیزیں، کم و بیش انداز میں نظر سے گذرتی ہیں اس کے ساتھ ساتھ موضوع کا تنوع بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ غربت وافلاس، عشق و محبت، اخلاق وسیاست، فرقہ واریت اور اس کی

ہولناکیاں، ذات پات اونچ نیچ، خلوص ووفا، مروت وبے مروتی، عورت مرد، وغیرہ موضوعات۔ پر کچھ نہ کچھ ضرور ملے گا، یہ باتیں ایاز کی سماجی شعور کی آگہی کا پتہ دیتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ حسن وعشق کے معاملات کو فلسفیانہ نظر سے دیکھتا ہے۔

تیکنیک اور اسلوب کے لحاظ سے بھی ایاز کے افسانے قابل لحاظ حد تک اچھے ہیں۔ افسانے لکھتے وقت میرے خیال میں ایاز کے پیش نظر خصوصی طور منشی پریم چند کے افسانے رہے ہیں۔ وہ پریم چند سے خاصا متاثر نظر آتا ہے مقصدیت اور حقیقت نگاری میں بھی اور اسلوب اور تیکنیک میں بھی۔ افسانے کے اجزائے ترکیبی یعنی عنوان وحدت تاثر، منظر نگاری، مقصدیت، زبان، پلاٹ، کردار نگاری، جزئیات اور ترتیب واقعات کے علاوہ "کہانی پن" جیسے عناصر کے ساتھ ساتھ جامعیت اور اختصار جیسے لوازمات بھی محمد شفیع ایاز کے پیش نظر ضرور رہے ہیں۔ مزید برآں ایاز نے چونکا دینے والے تجس اور تفحص کو بھی مناسب چابکدستی کے ساتھ ضروری جگہوں پر، اپنے افسانوں میں برتنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ایاز کے ان مختصر افسانوں میں ایک بڑی دنیا سمکی ہوئی ہے، ان میں ہمارے اپنے معاشرے کے ڈھیر سارے مسائل اور پریشانیوں اور الجھنوں کی عکاسی ہوئی ہے۔ اور غم عشق کے ساتھ ساتھ آلام روزگار کی گھمبیرتا بھی نظر آتی ہے۔

ایک مصروف بینک کی ملازمت ہمہ وقتی مشغولیت کی متقاضی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک مدت تک ایاز اپنے افسانوں کی طباعت کی طرف متوجہ نہیں ہو سکا۔ خوش قسمتی ہے کہ میرے مسلسل اصرار نے اصل ایاز کو جھنجھوڑا، جس کا خاطر خواہ نتیجہ "دردِ پنہاں" کی صورت میں آپ کے سامنے ہے، ایاز اردو ادب کا اگرچہ متعلم نہیں رہا ہے۔ لیکن کشمیریوں کی دوسری مادری زبان اردو ہی ہے جسے سب ہی بخوبی بول لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ اس لئے ایاز کا اردو زبان کو ذریعہ تحریر بنانا، تعجب کی بات بالکل نہیں ہے۔

آیاز کی خواہش کو مد نظر رکھتے ہوئے میں انے افسانوں کو نہ صرف پڑھا ہے، بلکہ اکے دکے جملوں کی ساخت، زبان کی روانی اور تحریر کی دروبست، اور بیان کی شگفتگی کو ذرا اور خوش گوار اور تازہ بنانے کے لئے میں نے کہیں کہیں حد بندیوں کا خیال رکھتے ہوئے، اپنا اختیار استعمال میں لایا ہے یہ اس لئے بھی ضروری تھا۔ کیونکہ آیاز اپنی ان "قدیم" چیزوں میں بذات خود کسی تنسیخ و ترمیم کے لئے کسی بھی طرح سے آمادہ نہیں تھا۔

میں نہایت خوش ہوں کہ بڑی مدت سے سوئے ہوئے ایک ادیب کو جگانے میں میں کامیاب ہو گیا، میری دعا ہے کہ آیاز صاحب اس بسم اللہ کے بعد باقاعدہ طور پر لکھنے کا کام جاری رکھیں اور اپنی تخلیقی کاوشوں سے اپنے ملک اور قوم کی اور خصوصاً اپنی اردو زبان کی خدمت انجام دیتے رہیں!

پروفیسر غلام محمد شآد

۵۱۔ بیت العارفین، سیکاپ روڈ بج بہارا، کشمیر۔ ۱۹۲۱۲۴

"رقاصہ"

گرمی کا موسم تھا، ہر شخص پسینے میں شرابور ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے ابھی ابھی دریا سے نہا کے نکلا ہو، ہال کی ساری کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ان کے پردے لپٹے ہوئے تھے۔ صرف دروازوں پر پردے لگے ہوئے تھے۔ ہال کی چھت میں پنکھے تو لگے ہوئے تھے، لیکن ان کی ہواؤں میں بھی حدت اور تپش ہی زیادہ تھی۔ اس کے باوجود ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ جہاں شہر کے اونچے اور ایلیٹ سماج کی سب ہی شوقین عورتیں اور مرد جمع ہوئے تھے۔

اگلی پوری تین نشستوں پر بیٹھی رنگ برنگے زرق برق پوشاک میں ملبوس عورتیں بجلی کے مختلف رنگوں کے قمقموں سے میچ (Match) کرتی ہوئی پھول بن کا سماں پیدا کر رہی تھیں۔ جو اپنی نرم ونازک گفتگو، خوش گپیوں، اور ہنسی مذاق سے بہار میں چڑیوں کی چہچہاہٹ کا ماحول بنائے ہوئے تھیں۔ باقی تمام سیٹوں پر مرد حضرات براجمان تھے۔ جن میں سے اکثر سگریٹ پھونکتے ہوئے دھوئیں سے فضا کو آلودہ بنا رہے تھے۔ اسی دوران میں کھڑکیوں کے سارے پردے پھیلا کے کھول دیئے گئے اور روشندان

بھی کھول دئے گئے، اکزاسٹ پنکھے بھی چلنے لگے، ہال کے سارے دروازے بند کر دیئے گئے اور سامنے اسٹیج پر سبز رنگ کی روشنی ایک دائرے کی صورت میں پھیلتی گئی۔ جس کے عین وسط میں ایک خوش لباس شخص نظر آنے لگا۔ ہال میں سارے حاضرین کے حیرت واستعجاب کو دور کرتے ہوئے یہ شخص حاضرین سے یوں مخاطب ہوا:۔

"ناظرین محترم! آپ اب مہربانی کر کے خاموش رہئے گا اب جلد ہی اسٹیج پر رقص کا پروگرام شروع ہونے والا ہے۔" پورے ہال میں سناٹا چھا گیا۔ سارے لوگوں کی نظریں اسی شخص پر مرکوز ہو گئیں۔ "آج آپ کے سامنے ہندوستان کی ایک مشہور رقاصہ اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کرنے والی ہیں۔ جس سے آپ کی روح کیف و مستی سے سرشار ہو جائے گی" اسی اثنا میں اسٹیج کے بائیں طرف سرخ روشنی پڑی، جو اسٹیج کے بیچ میں آنے لگی، اور اسی روشنی میں رقاصاؤں کا مخصوص لباس پہنے ہوئے ایک پری چہرہ دوشیزہ نمودار ہو گئی۔ سیاہ آنکھوں والی اس دوشیزہ کے لمبے لمبے بال اس کے سینہ پر آبشار کے مانند لہرا رہے تھے۔ جونہی یہ حسینہ اسٹیج کے درمیان کھڑی ہو گئی اور مسکراتے ہوئے، اپنے خوبصورت ہاتھ جوڑ کے ہال میں موجود لوگوں کو سلام و آداب کہنے لگی، تو سارے لوگ اپنی اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے اور زور زور سے تالیاں بجانے لگے۔

"معزز حاضرین! یہ ہیں ہمارے ملک کی مشہور رقاصہ، مس افشانہ۔

انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں کے اسکول میں پائی ہے۔ پھر شہر کے کالج سے گریجویشن حاصل کر کے ملک کے بڑے بڑے استادوں سے رقص اور سنگیت کی اعلیٰ ترین تربیت پائی ہے۔ بڑی بڑی سنگیت ناٹک اکاڈیمیوں اور سنگیت کلا کیندروں نے انھیں بڑے اعزازات اور انعامات سے نوازا ہے۔ یہ گذشتہ کئی سالوں سے اسی فن سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے رقص و سنگیت کو اپنا جیون ساتھی بنایا ہے اور اپنے اس فن سے ملک میں رہنے والے لاکھوں شائقین کو محظوظ و مسرور کر رہی ہیں۔ ہم سب کو ان کی فنکاری پر فخر ہے، ہماری نیک دعائیں ان کے ساتھ ہیں" .... یہ کہتے ہوئے یہ شخص اسٹیج سے آہستہ آہستہ اوجھل ہو گیا۔ اور حسین رقاصہ نے ایک بار پھر اپنے ہاتھ جوڑ کر حاضرین کو اپنا سلام اور آداب پیش کیا۔ ہال پھر ایک بار تالیوں سے گونج اٹھا اب دھیمی موسیقی بجنے لگی اور ساز کی لئے بھی بڑھتی گئی۔ پھر رقاصہ کے قدم اٹھنے لگے۔ اور دیکھتے دیکھتے ہی رقص شروع ہو گیا، چند ہی لمحوں میں حسین رقاصہ نے سارے حاضرین کو اپنے ساحرانہ رقص سے مسحور کر کے گرویدہ بنا دیا۔ ساز پر قدموں کا اٹھنا، رنگ رنگ کی تھرکتی ہوئی چال، اور اس پر حسن کے ناز و انداز والی ادائیں........ مسرت اور حیرت کے ملے جلے ایک الف لیلوی منظر سے کچھ کم نہ تھا۔

دور آخری نشست پر بیٹھے ہوئے دو نوجوان سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ "ندیم دیکھ کیا شاندار منظر ہے۔ کیا آپ نے آج تک کبھی ایسا

رقص دیکھا ہے۔ یہ ساز اور اس پر قدموں کی یہ تال،.......... یہ تو ایک طلسمات نظر آتا ہے۔" نوجوان اپنے ساتھی ندیم سے کہے جا رہا تھا۔ جو حیرت کی آنکھوں سے رقاصہ اور اس کے رقص کو دیکھ کے داد دے رہا تھا۔

اس کے چہرے پر عجیب کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ اور نہ جانے وہ کن خیالوں کی وادیوں میں کھویا ہوا تھا۔ ہر شخص رقص کی تعریفیں کر رہا تھا......، مگر نوجوان کا ساتھی.......... ندیم تو بالکل گم سم.......... اور مکمل خاموش تھا۔ خشک ہونٹ اور چہرے پر نمایاں اداسی، اس کے اندرونی کرب اور اس کی روحانی پریشانی کا احساس دلا رہے تھے۔

آٹھ برس پہلے ندیم کو ملازمت کے سلسلے میں دہلی تبدیل کیا گیا، اس کی عمر ان دنوں پچیس کے لگ بھگ تھی دہلی میں وہ ایک اجنبی تھا۔ نہ کسی سے واقفیت اور نہ کوئی جان پہچان۔ وہ روز اپنے دفتر جاتا تھا اور دفتر سے واپس آکر اپنے کمرے میں ضروری کام کاج سے فراغت پا کر.......... فرصت کے لمحات میں کتابوں کا مطالعہ کرنا اس کا معمول بن گیا۔ اس کا رہائشی کوارٹر شہر کے اس علاقے میں واقع تھا، جہاں اکثر وہی لوگ رہتے تھے جو دہلی میں کسی تعلیم و تربیت، یا ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے۔ ایک روز اس نے اپنے کمرے کے پچھلے طرف کی کھڑکی سے باہر دیکھا، تو اس کی نظر سامنے والے مکان پر پڑی، جہاں تیسری منزل سے ایک نوجوان لڑکی کھڑکی پر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس منظر نے ندیم پر عجیب کیفیت طاری کر دی یہ

کیفیت ایسا جادو کر گئی کہ پھر وہ ہر روز اسی منظر کا منتظر رہنے لگا، دن گذرتے گئے، لیکن آنکھیں چار ہونا معمول بن گیا۔

ایک دن ندیم خلاف معمول شام کے وقت ٹہلنے کے لئے باہر نکلا، خشک وگرم ہوائیں، شور وغل، اور فضا کی آلودگی، ان سب نے ندیم کے دل میں وادیٔ کشمیر کی یاد تازہ کر دی، ہرے بھرے کھیت، لہلہاتا ہوا سبزہ زار، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، سرسبز وشاداب جنگل، خاموش فضا، اور صاف وشفاف ماحول.........، کشمیر کا ذرہ ذرہ اپنے حسن میں یکتا اور بے مثال ہے۔ انہی خیالات میں مگن، ندیم ابھی کچھ دور بھی نہ چلا تھا، کہ اسے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی، اس نے جونہی پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کی نظریں ایک لڑکی پر پڑیں.........، ارے ہاں وہی لڑکی جو اس کے کوارٹر کے پیچھے والے مکان میں رہتی ہے۔ سخت گرمی کی وجہ سے کھلے اور ڈھیلے ڈھالے پوشاک میں ملبوس یہ لڑکی نزدیک کی ایک پارک میں ایک درخت کے سائے کے نیچے بیٹھ گئی۔ ندیم بھی پسینے سے شرابور تھا۔ وہ بھی آ کے اسی درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ چند لمحے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے.........اور آخر ندیم نے محتاط انداز میں لڑکی سے پوچھا......... آپ تو وہ نہیں.........جو میرے رہائشی کوارٹر کے پیچھے والے اونچے مکان کی تیسری منزل میں رہتی ہیں''؟

''ہاں......... آپ کا اندازہ بالکل درست ہے، میں وہی ہوں''

لڑکی نے جواب دیا۔

"آپ کا تعارف.........." ندیم نے پوچھا

"میں.......... ایک ڈانسر ہوں، ہاں ڈانسر، میرا نام افشانہ ہے اور میں ہریانہ کی رہنے والی ہوں، اسی سال گریجویشن پاس کرلی ہے۔ اور اب یہاں آکر سنگیت اور رقص کی تربیت حاصل کررہی ہوں.........." لڑکی نے جواب دیا۔

"یہاں کس کے ساتھ رہتی ہو"؟

"یہاں میں اکیلی رہتی ہوں، گھر میں میرے چاچا ہیں، جو میری پرورش کرتے ہیں کیونکہ میرے ماتا پتا میرے بچپن ہی میں مجھے چھوڑ کر دوسری دنیا کو سدھارے تھے۔ اور آپ"؟

"میرا نام ندیم ہے اور کشمیر کا رہنے والا ہوں ایک سال سے دہلی میں ہوں اور بینک میں ملازمت کررہا ہوں۔ ابھی اور ایک سال یہاں رہنا ہے۔ گھر میں میرے ماں باپ ہیں اور ایک چھوٹا بھائی۔" ندیم نے اپنا تعارف کرتے ہوئے جواب دیا۔

کچھ وقت گذارنے کے بعد دونوں اپنی اپنی جائے رہائش پر آگئے۔ اپنے کوارٹر میں پہنچ کر ندیم کو احساس ہوا کہ شاید افشانہ کے دل میں بھی اس کا پیار بھرا ہوا ہے۔ ندیم کا دل تو پہلے ہی اس کی زلف گرہ گیر میں اٹک گیا تھا، دھیرے دھیرے افشانہ بھی ندیم کے عشق میں اسیر ہوگئی۔ پھر دونوں ایک

دوسرے کو چاہنے لگے۔ اور دیوانہ وار .... ایک دوسرے کے گرویدہ ہوگئے۔ پیار کی چنگاری شعلہ بن کر بھڑکنے لگی۔ آپس میں ملاقاتیں، اب روز مرہ کا معمول بن گیا۔ پھر قسموں اور وعدوں نے جنم لیا ایک دوسرے کے ساتھ رہنے، اور وفاؤں کو نبھانے کی قسمیں اور ....،

"افشانہ .... مجھے کل کشمیر جانا ہے، اچانک طور پر مقررہ وقت سے پہلے ہی چھ ماہ، میرا تبادلہ ہو گیا ہے۔ لیکن میں پھر آؤں گا .... افشانہ! تم جانتی ہو کہ تیرے بغیر تو میں نہیں رہ سکتا ہوں۔ میں ایک دو مہینے کے اندر اندر اپنے والد صاحب کے ساتھ یہاں آؤں گا، اور تمہیں اپنا جیون ساتھی بنا کر ہی واپس جاؤں گا۔ لیکن تم میرے ساتھ وعدہ کرو .... کہ تم تب تک میرا انتظار کرو گی۔ پیاری افشانہ میرے ساتھ وعدہ کرو" ندیم افشانہ سے کہے جا رہا تھا،

افشانہ کی آنکھیں پر نم تھیں، اور چہرے پر ناامیدی سے پر جدائی کے احساس سے ابھرنے والی غم آگین کیفیت نمایاں تھی۔

"میں .... میں ....، میں تمہارا انتظار کروں گی .... ندیم .... اس وقت تک ...... تک جب تک تم نہ آؤ گے .... میں وعدہ کرتی ہوں ندیم ہاں .... وعدہ کرتی ہوں .... پکا وعدہ .... "افشانہ کی آواز ہچکیوں میں ڈوب گئی ....،

کشمیر پہنچ کر ندیم دفتر کی فائیلوں میں ایسے کھو گیا۔ کہ وہ سب کچھ بھول گیا۔

دل کی کوئی بھی بات اس کی یادداشت کے نہاں خانے میں محفوظ نہ رہی۔ نئے دوست اور نئے یار ملے، وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ندیم کے خیالات بھی بدل گئے، اس کی شادی ہوگئی اور اس کی شادی شدہ زندگی میں ایک حسین بچی نے بھی قدم رکھا، مگر اس کی شریک حیات شادی کے صرف تین سال بعد کینسر کے جان لیوا مرض کی نذر ہوگئی۔ اور اس طرح ندیم کی زندگی میں اس بچی کے سوا اور کچھ بھی نہ رہا۔ دوستوں اور رفیقوں نے اسے دوسری شادی کرنے کے لئے کافی اصرار کیا مگر ندیم نے بالکل انکار کیا۔ اس کا دل بجھ گیا تھا وہ اب دوسری بار شادی کرنے کے بارے میں کبھی سوچتا بھی نہیں تھا۔ مگر آج.......... آج اس کے دل نے نئی کروٹ لے لی، افشانہ کو رقاصہ کے روپ میں دیکھ کر.......... وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا "میں نے افشانہ کو دھوکہ دیا ہے میں ظالم ہوں.......... افشانہ مجھے معاف کرو.......... تم میری زندگی ہو.......... افشانہ تم مجھے نئی روح بخشو تاکہ میری لٹی ہوئی مسرتیں واپس آجائیں۔ میں وقت کے تیز دھارے کے ساتھ بہہ گیا تھا، میری غلطی معاف کرو.......... اور اب مجھے ایک اور موقعہ دیدو.......... افشانہ" ان احساسات نے ندیم پر عجیب کیفیت طاری کردی، اور وہ اسی میں گم سم اور خاموش پڑا رہا۔ رقص ختم ہوگیا۔

حسین رقاصہ نے اپنے سیمیں ہاتھ پھر جوڑ کر سب لوگوں کا شکریہ ادا کیا، اور پردے کے پیچھے چلی گئی۔ اسی کے ساتھ ہی سب لوگ اپنی

اپنی سیٹوں سے اٹھ کر ہال سے باہر نکل آئے۔

ندیم رات بھر جاگتا رہا اور ماضی کی یادیں اس کو کوستی رہیں "میں ضرور افشانہ سے ملوں گا، اور اس سے معافی مانگوں گا، مجھے یقین ہے کہ وہ میرا کہنا ضرور مانیگی، وہ مجھے دل سے چاہتی تھی، یہ شاید آسمان والے کا ہی کرشمہ ہے کہ وہ یہاں آئی، اور مجھے اس سے ملنے کا موقعہ ملا۔ اور پھر میری زندگی میں بھی ایک خلا ہے۔ جو صرف افشانہ ہی پر کر سکتی ہے۔ خدا نے مجھے ایک بار پھر موقعہ بخشا ہے۔ اور اب کی بار میں افشانہ کو اپنا بنا کر ہی دم لوں گا............، صبح سویرے ہی اس کے پاس جاؤں گا............ ہاں ضرور جاؤں گا"

"منیجر صاحب کل شام جو پارٹی یہاں رقص کا پروگرام دکھا رہی تھی، وہ کہاں ہے"؟ ندیم نے ہال کے منیجر سے پوچھا۔ "وہ تو کل رات ہوٹل میں گئے اور ہاں............ وہ آپ کو سٹی ہسپتال میں ملیں گے۔ کیوں کہ ان کی رقاصہ کو کچھ تکلیف ہوئی تھی۔ اور وہ اسے سٹی ہسپتال لے گئے۔"

منیجر نے کہا۔ ہسپتال کا نام سنتے ہی ندیم کے اوسان خطا ہو گئے۔ جلدی جلدی ٹیکسی میں سوار ہو کر وہ سٹی ہسپتال پہنچا۔ اور وہاں پوری پارٹی کو پریشان پایا۔ رقاصہ کو خون کی سخت ضرورت تھی۔ مگر اس کا بلڈ گروپ کسی سے نہیں ملتا تھا۔

ندیم نے آگے بڑھ کر خون کا ٹیسٹ کرایا، اور اتفاق سے ڈاکٹروں

نے مطلوبہ گروپ کا خون پایا۔

"ہاں اب رقاصہ کی جان بچ سکتی ہے" ڈاکٹر نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا............ ندیم نے مطلوبہ مقدار کا خون دیا اور ڈاکٹر خون اندر لے گیا............ لیکن چند ہی لمحوں کے بعد مایوسی کے چہرے کے ساتھ ڈاکٹر باہر نکلا............ "مجھے افسوس ہے کہ رقاصہ کی جان نہیں بچ سکی، وہ خون کا ایک قطرہ لئے بغیر ہی چل بسی............"

"یادوں کا سہارا"

ارے بھئی امین!.......... امین.......... امین" یہ آواز سنتے ہی امین چونک پڑا، اور زاہد کو غیر متوقع طور پر اس طرح سے پکارتے ہوئے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا آج پورے تین برس بعد زاہد نے اپنی زبان پر امین کا نام لیا تھا.........، امین نے اپنے قدم روک کر زاہد کی طرف دیکھا.........، زاہد نے کہا کہ شبروزہ کا بھائی ریاض ابھی ابھی کار کے ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ O ط ...." امین کی زبان سے بے ساختہ نکل کر، اس پر سکوت کا جمود طاری ہوگیا۔ اور اس کے دماغ میں عجیب و غریب تصویریں ابھرنے لگیں۔ ماضی کی وہ یادیں اس کو، کوسنے لگیں جنہیں وہ ہمیشہ کے لئے بھلانا چاہتا تھا.........،

امیں ایک بد قسمت لڑکا تھا، جس کے سر سے والد کا سایۂ شفقت ہمیشہ کے لے اٹھ گیا تھا، وہ مختلف تکالیف برداشت کر کے تعلیم جاری رکھے ہوئے تھا، زاہد اس کا قریبی دوست تھا۔ ایک امیر گھرانے کی لڑکی شبروزہ بھی ان دونوں کے ساتھ کالج میں فرسٹ ایر کی طالبہ تھی امیں دل وجان

سے شبر وزہ کو چاہتا تھا، اور شبر وزہ بھی اپنے دل کی عمیق گہرائیوں سے امین
سے پیار کرتی تھی۔ شبر وزہ کی لمبی لمبی سنہری زلفیں، بڑی بڑی آنکھیں،
خوبصورت قدو قامت موہنی صورت، نرم و نازک گفتگو، اور سلیقہ مندی
کے ساتھ پہنا ہوا، پر کشش لباس.......... یہ سب امین کے دل کو ایسے
بھا گیا تھا، جیسے مجنوں کو لیلیٰ، دونوں ایک دوسرے کے دیوانے تھے
لیکن .... بیچ میں سماج کی کھڑی کی ہوئی دیوار .... حائل تھی۔ امین
غربت کا شکار .... اور ناامیدی کے دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔ لیکن شبر وزہ
ان تلخ ترین حقائق کو جانتے ہوئے بھی امین کی گرویدہ ہو گئی تھی، اور امین کو
اپنے دل کے نہاں خانے میں سجائے ہوئے مطمئن تھی۔ دوسری طرف یہی
حال امین کا بھی تھا۔ جو اپنی المناک پریشانیوں کو کبھی کبھی بھول کر پیار کے
ساگر کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا تھا۔ جب سے ایک دفعہ کالج میں منعقدہ
مباحثہ میں امین نے خصوصی امتیاز کی پوزیشن حاصل کی تو شبر وزہ خوشی سے
پھولے نہ سمائی تھی۔

چونکہ زاہد، امین کا قریبی دوست تھا۔ اس لئے وہ امین کے تمام
حالات اور رازوں سے اچھی طرح سے واقف تھا۔ اسے بہ خوبی معلوم تھا کہ
امین اور شبر وزہ ایک دوسرے کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہتے تھے۔ لیکن
رسم و رواج کے بندھن، اونچ نیچ کے امتیازات اور غربت اور امیری کی حدود
میں بٹے ہوئے سماج کے سامنے وہ دونوں بے بس تھے۔ اسی لئے وہ ایک

دوسرے کے سامنے کھل کر محبت کا اظہار نہیں کرپاتے تھے۔

دوسری طرف امین کا قریبی دوست زاہد، شیطان کے ہتھے چڑھ چکا تھا، اس کے دل میں کھوٹ اور نیت میں فتور پیدا ہو گیا۔ اور وہ رقابت کی آگ میں جلنے لگا تھا۔ اب وہ دوستی کے روپ میں رہتے ہوئے امین اور شبر وزہ میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔

اسی میں اُدھیڑ بن رہتے ہوئے اس نے سوچنا شروع کیا کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کے لئے اسے کوئی نہ کوئی ترکیب کرنی چاہئے۔ کیونکہ اس کی حریصانہ نظریں شبر وزہ پر مرکوز تھیں اور وہ اسے اپنے خواب کی تعبیر بنانا چاہتا تھا۔ آخر کار اس کے ذہن میں برائی نے جنم لے ہی لیا۔ اس نے کسی کے ہاتھ سے امین کے نام خط لکھوایا ایسے جیسے کہ یہ خط شبر وزہ ہی نے خود لکھا ہو۔ کالج پہنچتے ہی زاہد نے امین سے کہا......... "ارے امین بھائی! اگر میں تمہیں شبر وزہ کی طرف سے لکھا ہوا خط دیدوں تو"؟

"تو......... تو میں تمہارا بے حد ممنون اور شکر گذار رہوں گا" امین فرط مسرت سے بول اٹھا۔

"دیکھو امین!......... تم پہلے چائے کا ایک کپ پلاؤ اور بس......... "زاہد نے کہا۔

اچھا تو ٹھیک ہے......... تو اب دیدو خط" امین نے زاہد سے کہا دونوں نے چائے پی لی۔ اور امین نے خط پکڑتے ہی اسے جیب میں رکھ دیا، خوشی سے

اس کا احساس ہوا بردوش ہو گیا۔ مگر اسی لمحہ کالج میں گھنٹی بجی اور دونوں کلاس میں داخل ہو گئے۔ دونوں بے حد خوش تھے۔ زاہد اپنی شیطانی پر اور امین خط پانے پر۔ امین خط پڑھنے کے لئے اضطراب کے ساتھ منتظر تھا۔ اور اسی وجہ سے وہ کلاس میں پروفیسر کے لیکچر کی طرف بھی متوجہ نہیں تھا۔ وہ ایک نظر سامنے والے بینچ پر بیٹھی ہوئی شبروزہ کی طرف ڈالتا تھا اور دوسری نظر اپنی جیب کی طرف جس میں اس نے اپنے خیال کے مطابق شبروزہ کا خط رکھا ہوا تھا۔ اس کے آج کا ایک ایک لمحہ ایک ایک برس کے برابر ہوتا جارہا تھا.......کیوں نہیں ہوتا.........؟ آخر انتظار کی گھڑیاں صدیاں نظر آتی ہیں۔ اور مشکل سے گذرتی ہیں۔ وہ کلاس میں عجیب وغریب خیالات میں کھویا رہا۔ وہ اتنا خوش تھا کہ جیسے وقت نے ساری خوشیاں کہیں سے لاکر اس کے دامن میں ڈال دی ہوں۔ مشکل سے چار پیریڈ گذر گئے۔ اور جب آخری کلاس بھی ختم ہو گئی تو امین خوشی سے چھلانگ مار کر دروازہ سے تیزی کے ساتھ نکلا۔ جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے وہ کالج سے باہر آیا اور خلاف معمول تانگے پر سوار ہوا اور سپنوں کے آکاش میں اڑنے لگا۔

گھر پہنچتے ہی سیدھے اپنے کمرے میں جاکر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر اس نے خط کھولا

"میرے محبوب۔

اگرچہ میرے اور تمہارے درمیان ظاہر میں بہت فاصلہ ہے مگر

میں سوچتی ہوں کہ تم میرے بہت قریب ہو، گو کہ میں آج تک اپنے دل کی بات ظاہر نہ کر سکی، مگر آج دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر.......... لکھ رہی ہوں۔

اس مختصر خط کو دل کی طویل داستان کا خلاصہ سمجھنا.......... تمہارے پیارے جواب کا انتظار رہے گا۔

تمہاری

ش، ر"

امین خط پڑھ کر بہت ہی خوش ہوا، اس کی زندگی میں نئی بہار آگئی اور اس کی روح تازہ ہو گئی۔ یہ اس کی زندگی کے نئے باب کا آغاز تھا۔ اسی لئے وہ اس خط کا جواب دینے میں زیادہ تاخیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنی سب بقیہ مصروفیات کو نمٹانے کے بعد رات کی تنہائی میں بیٹھ امین نے قلم اٹھا کر فرط انبساط کے ساتھ لکھنا شروع کیا:۔

"میری جان!

تمہارا خط دیکھ کر مجھے کتنی مسرت ہوئی اس کا اندازہ تم نہیں لگا سکتی ہو۔ میں تو پہلے ہی سے محبت کی آگ میں کس طرح سے جل رہا ہوں، لکھ نہیں سکتا.......... تم نے شعلے بھڑکا دئے اور خط نے ان کو ہوا دی..........،

تمہارا

"امین"

رات بھر امین کروٹیں بدلتا رہا۔ اور محبت کی حرارت نے اس کے نیند بھی اڑا دی، نہ جانے اسے کب نیند آ گئی، صبح جب اسے ماں نے جگایا تو بہت دیر ہو چکی تھی، ہاتھ منہ دھو کے ناشتہ وغیرہ سے فراغت کے بعد وہ کالج کی طرف چل دیا۔ کالج پہنچ کر اس نے سب سے پہلے زاہد کی تلاش شروع کی۔ جونہی اسے زاہد ملا تو دونوں کالج کے گرلز لان کے اردگرد ٹہلنے لگے۔ ایک دم امین کی نظر شبر وزہ پر پڑی اور اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے جسم میں انگارے بھر دیئے ہوں۔ اس پر ایک عجیب کیف کا عالم طاری ہو گیا۔ مگر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے......... وہ وہاں سے چل پڑا۔ وہ چاہتا تھا کہ زاہد خط کا ذکر چھیڑ دے کیوں کہ اسے اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ خود زاہد سے اس بارے میں کچھ کہتا۔

پورا دن امین نے اسی مخمصے میں گذارا، چھٹی ہوتے ہی دونوں.......... امین اور زاہد ایک ساتھ کالج سے باہر آئے۔ راستے میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے زاہد نے جب خط کی بات چھیڑ دی.......... امین نے اس موقعہ کو غنیمت پاکر زاہد کے ہاتھ میں اپنا لکھا ہوا جوابی خط تھما دیا۔ زاہد نے چھٹی لے لی اور چل دیا۔

زاہد نے گھر پہنچ کر چھٹی کھولنے کے بعد...... پڑھی، اور اپنی شیطانی پر خوش تھا، اسے اس بات کا اچھی طرح سے علم ہوا کہ امین دل و جان سے

شبر وزہ کو چاہتا ہے۔ وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ آخر اس کے شیطانی دماغ میں ایک بات آہی گئی .... وہ جلدی سے گھر سے نکل کر .... سیدھے شبر وزہ کے بھائی ریاض کے پاس گیا، اور اسے امین کا خط دکھایا۔ جب شام کے بعد شبر وزہ اپنے ماں باپ کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی تو ریاض نے چھٹی کھول کر والد صاحب کو دکھائی، چھٹی دیکھ کر شبر وزہ کے والد دم بخود ہو کر رہ گیا، سارے گھر میں اندھیرا چھا گیا شبر وزہ سے سختی کے ساتھ پوچھ تاچھ کی گئی۔ گھر والوں نے سوچا کہ ان کے خاندان پر یہ بدنما داغ بن کر رہے گا۔ طے پایا کہ شبر وزہ کا گھر سے باہر جانا بند کیا جائے اور اس کمینے امین کی خبر لی جائے۔

اتفاقاً دوسرے ہی دن امین کا گذر شبر وزہ کے محلے سے ہوا۔ زاہد نے اسے روکا، جب امین نے اس کی خیریت پوچھی، تو اس نے کوئی بھی جواب نہیں دیا۔ اسی اثنا میں شبر وزہ کا بھائی ریاض بھی آگیا جو دراصل اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اب دونوں .... زاہد اور ریاض نے بغیر کچھ پوچھے .... مل کر، امین کی خوب پٹائی کی۔ ”کمینے‘ ذلیل، بدمعاش .... تیری یہ جرأت .... “ریاض چلایا۔ امین ہکا بکا رہ گیا۔ وہ بے قصور تھا۔ مگر حالات اور واقعات کے سامنے اس کا قصور عیاں تھا۔

شام کو گھر پہنچ کر امین نے گھر کا ماحول کچھ عجیب سا پایا گھر والوں کو اس واقعہ کی پوری خبر ہوئی تھی۔ اور وہ امین کی اس حرکت پر آگ بگولہ

ہو گئے تھے۔ امین اپنے کئے پر شرمندہ تو ضرور تھا، لیکن اپنی صفائی پیش کرنے سے معذور تھا.........، اس کا کالج جانا بند کیا گیا اور طے پایا کہ وہ کسی کام پر جا کر روٹی روزی کمائے۔

امین کی زندگی کا سہارا ختم ہو گیا۔ دھیرے دھیرے ماضی کی یادیں اس کے لئے وبال جان بن کر رہ گئیں اور مستقبل ایک ہیبت ناک عفریت کی طرح اس کے دل و دماغ پر چھا گیا۔ وہ نوکری کر کے کچھ کما لینا چاہتا تھا، لیکن نوکری کہاں سے ملتی.........؟ وہ دو سال تک دربدر بھٹکتا رہا، سڑکوں کی خاک چھانتا رہا، دفتروں کے دروازے کھٹکھٹاتا رہا......... مگر بے سود.........،

اللے تللے کر کے آخر ایک دن تقدیر کو اس پر رحم آ ہی گیا اس کو ایک اسکول میں ٹیچر کے طور پر ملازمت مل گئی۔ زندگی کی گاڑی نے رفتار پکڑ لی......... مگر اس کا پٹرول کب کا ختم ہو چکا تھا۔ بھلا پٹرول کے بغیر گاڑی کیسے چل سکتی ہے؟۔ اب وہ نوکری کے سلسلے میں ایک دور دراز علاقے میں آ گیا تھا، اور اکیلے ہی زندگی بتا رہا تھا، اس کا اور کوئی مشغلہ بھی نہیں تھا، اس نے اکیلے پن اور تنہائی کے ساتھ اپنا ناطہ جوڑ دیا تھا۔ تنہائیوں نے بھی دوستی نبھائی تھی......... لیکن آج......... آج اسے اپنا ماضی بری طرح سے یاد آ رہا تھا، وہ ان جان لیوا لمحوں کو بھول جانا چاہتا تھا، لیکن یہ یادیں......... اس کا ساتھ نہیں چھوڑتیں......... اس نے زخموں پر

مرہم لگا کر انہیں مندمل کرنا شروع کیا ہی تھا............ مگر آج زاہد کی باتوں نے اس کے ان زخموں کے کھرنڈ کو پھر سے ادھیڑ دیا۔ جس طوفان کو امین نے بڑی مشکل سے قابو میں کر کے رکھا تھا............ آج زاہد کی باتوں نے اس میں کرب واذیت کے ساتھ بڑی شدت پیدا کی............ بھولے ہوئے المناک حادثے کے درد میں اضطراب کی زبردست لہر اٹھنے لگی، یاد ماضی عذاب الیم بن گئی وہ تڑپ اٹھا، اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ ہواؤں کے روش پر بے تحاشا اڑا جا رہا ہے۔ وہ روشن بلندیوں پر پرواز کر رہا تھا............ اور اچانک اسے ایسا لگا کہ وہ تاریک پستیوں کی طرف تیزی کے ساتھ گر رہا ہے۔ اس کا دم گھٹنے لگا............ اور پھر وہ ایک بلند چیخ کے ساتھ جاگ اٹھا۔ آٹھ بج چکے تھے اور اسے اپنے دیر سے جاگنے پر بہت غصہ آرہا تھا............ کیوں کہ اسے پورے آٹھ بجے ایک دفتر میں انٹرویو کے لئے حاضر ہونا تھا..................،

”حسرت“

”ابان جان! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ گھر پر قیام کیجئے۔
ڈاکٹر صاحب نے بھی آپ کو مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے اور پھر دوائی بھی
وقت کی پابندی کے ساتھ استعمال کرنی ہے۔ آپ کی کھانسی کا زور اب تو اور
بھی بڑھ گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تاکید ہے کہ جب تک آپ مکمل آرام
نہیں کریں گے۔ دوائیاں اثر نہیں کر سکتی ہیں“۔

--پرویز اپنے بوڑھے باپ سے کہے جا رہا تھا۔

”نہیں بیٹا۔ نہیں۔ آج تو مجھے خان صاحب سے ضرور ملنا ہے۔ انہوں نے
وعدہ کیا ہے کہ ”آج کی بار آپ کے پرویز کی ملازمت پکّی کر دیں گے“۔
دیکھ بیٹا۔ دو سال سے لگاتار ان کی حویلی کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔ اب کی بار
تو انہوں نے مجھے تو خود ہی آنے کو کہا ہے۔ میں یہ موقعہ ہاتھ سے نہیں
جانے دوں گا۔ انشاء اللہ آج میں تمہاری نوکری کا آرڈر ساتھ لے کر ہی
آؤں گا۔ تمہیں ایسے دیکھ کر میرے دل پر کیا گذرتی ہے بیٹا۔ زبان پر نہیں
لا سکتا۔ بیٹا میں تمہارا حال دیکھ رہا ہوں۔ تمہارا گلاب ایسا چہرہ اب تو پیلا

پڑ گیا ہے اور تم اپنی طرف کوئی دھیان نہیں دیتے ہو۔ کل ہی تو تم نے میرے لئے دوائی لائی مگر اپنے لئے نہیں۔ اور ہاں بیٹا۔ اگر بزاز آئے گا تو اسے کہدینا کہ جونہی میں ٹھیک ہو جاؤں گا اس کا ایک ایک روپیہ ادا کروں گا-- انشاءاللہ''۔ یہ کہہ کر پرویز کا ابا جان بیساکھی کے سہارے کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ باہر جانے لگا۔ پرویز کی نظریں دور تک اسے تکتی رہیں یہاں تک کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ پھر پرویز گھر کے اندر داخل ہوا۔

پرویز ایک خوش پوش نوجوان تھا، لیکن اس کے چہرے بُشرے سے صاف نظر آرہا تھا کہ کوئی غم اندر ہی اندر اسے کھائے جارہا تھا۔ اول وہ لاپرواہی کے ساتھ اسے چھپاتے ہوئے اپنے آپ کو بنائے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی قسمت ہی کچھ ایسی تھی، ورنہ پانچ سال پہلے اس نے بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ لیکن تقدیر نے کبھی بھی اس کا ساتھ نہیں دیا، بھائی بہن تو تھے نہیں۔ بس وہ صرف ایک امید کے سہارے جی رہا تھا اور وہ امید تھی۔ اس کا ابا جان- لیکن یہ امید روز بروز نااُمیدی کی جانب پیش قدمی کر رہی تھی۔ پرویز کی زندگی۔ اور اس کی قسمت دریا کے دو کناروں کے مانند۔ آپس میں ملنے کی حسرت لئے ایک دوسرے کو صرف تکتے رہتے تھے۔ اس کے باوجود پرویز ایک موہوم اور دُھندلی امید کے سہارے زندہ تھا۔ مایوسیوں اور نااامیدی کے گھپ اندھیرے میں کبھی کبھی اُسے روشنی کی کرن

نظر آتی تھی۔ کہ کبھی اس کے پژمردہ گلشن میں بہار آئیگی۔ اس کے عمر رسیدہ ابّا جان کے چہرے سے پریشانیوں اور مصائب کی مہیب چھایا ہٹ جائیگی اور خوشیاں ان کی تقدیر بن جائینگی۔ لیکن ابھی تو بدحالی سے اَٹے ہوئے حال پر نظر اٹک کے رہ گئی تھی۔ بزاز کا قرضہ باقی تھا، دوافروش کا بار بار کا تقاضا، سبزی اور دودھ والے کا حساب، اور بہت سے اخراجات کا بوجھ۔ اور اس طرح پرویز کا دماغ ماؤف اور ذہن منتشر تھا، اس کی حالت قابل رحم تھی۔

"ٹھہرو-- ہے بابا-- ٹھہرو-- کون ہو تُم؟، کہاں جانا ہے؟" خان صاحب کی کوٹھی کے گیٹ پر چوکیدار نے پرویز کے والد سے پوچھا۔

"میں-- میں جناب شیر خان ہوں اور مجھے خان صاحب سے ملنا ہے"۔

"ٹھہرو ابھی، خان صاحب اندر ہیں، ابھی باہر آئیں گے تب تک لان میں انتظار کرو" چوکیدار نے کہا، شیر خان لان کی طرف ہولیا اور بیساکھی کے سہارے ہی نیچے بیٹھ گیا۔ ایک آدھ گھنٹے کے بعد خان صاحب باہر آئے۔ شیر خان نے آداب بجالایا۔

"اچھا تُم-شیر خان-- بولو کیا حال ہے" خان صاحب نے پوچھا۔

"بس جناب-- آپ کی عنایت ہے" شیر خان نے حلیمانہ لہجے میں جواب دیا۔

"اچھا یہ بتاؤ شیر خان-- آج تم کیسے آئے ہو؟"

"جناب آپ کو تو معلوم ہی ہے۔ میرا بیٹا پرویز پڑھ لکھ کر ابھی بیکار ہے۔ اس کے لئے نوکری کے سلسلے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ جناب "شیر خان نے کہا۔

"ارے ہاں! ٹھیک ہی کیا تم نے کہ تم آئے۔ تم ابھی یہیں ٹھہرو، رینہ صاحب ابھی آتے ہوں گے ویسے تو میں نے ان کو پہلے ہی بتا رکھا ہے۔ پھر بھی ٹھہرو۔ ابھی بات ہو جائیگی" خان صاحب کی زبان سے یہ الفاظ سنکر شیر خان کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

"آداب عرض جناب" ایک بھاری بھر کم آواز لگاتے ہوئے ہلکی سُنہری لکیروں والے نیلے رنگ کا قیمتی سوٹ زیب تن کئے اور ٹائی پہنے ہوئے لمبے قد کا ایک بیورو کریٹ ٹائپ کا ایک بارعب شخص اندر لان میں آیا--

"آیئے --رینہ صاحب! کرسی پر تشریف رکھیئے! میں آپ کا ہی انتظار کر رہا ہوں"۔

"میرا انتظار کر رہے ہیں"؟ رینہ صاحب نے تعجب کے انداز میں پوچھا

"ہاں آپ کا ہی انتظار تھا" خان صاحب جواب میں کہا۔

"وہ کیسے۔ کیا میرے لئے کوئی حکم ہے"؟ رینہ صاحب نے پوچھا۔

"یہ جو آپ کے سامنے ہے اس کا نام شیر خان ہے۔ نہایت ہی مشکل حالات اور اقتصادی پریشانیاں جھیل کر اس نے اپنے بیٹے کو گریجویشن تک پڑھایا ہے۔ آپ نے بتایا تھا کہ آپ کے اپنے محکمہ میں دو چار خالی اسامیاں پُر کرنی

ہیں، انہی میں سے کسی ایک اسامی پر شیر خان کے بیٹے کو بھی تعینات کیجئے۔ یہ میرا بالکل ذاتی معاملہ ہے اور مجھے اُمید ہے کہ آپ کی مدد سے یہ کام ضرور پورا ہو جائیگا"۔

خان صاحب نے رینہ صاحب سے کہا۔

"مگر جناب والا! ان اسامیوں کو پُر کرنے کے لئے باضابطہ نوٹس محکمہ سے کب کی اجرا ہو چکی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں امیدواروں کی طرف سے درخواستیں بھی موصول ہو چکی ہے۔ اور اس کارروائی کی باقاعدہ فائل بن گئی ہے۔ جس میں ردّو بدل، یا اضافہ خلافِ ضابطہ ہے" رینہ صاحب نے اپنی پوزیشن معذوری کے ساتھ واضح کر دی۔

"دیکھئے رینہ صاحب! یہ میرا بالکل ذاتی معاملہ ہے، اور نہایت ہی اہم ہے۔ آپ کو کسی نہ کسی طریقے سے یہ نیک کام انجام دینا ہی پڑے گا"۔ خان صاحب نے معاملہ کی اہمیت اور ضرورت جتاتے ہوئے مکرر کہا۔

"جناب! میں اپنی طرف سے بھرپور کوشش کروں گا کوئی جگہ کسی وجہ سے خالی رہ گئی ہو، تو میں اس سائل کے بیٹے کو وہاں ایڈجسٹ کروں گا۔ آپ پورا وشواس رکھئے"۔ رینہ صاحب نے خان صاحب کو یقین دلایا۔

"رینہ صاحب! شیر خان آپ کے ساتھ ہی آئے گا اس نے اپنے بیٹے کی اسناد اور ضروری کاغذات اپنے ساتھ لائے ہیں -- اور ہاں شیر خان اگر کسی قسم کی مشکل پیش آئے تو مجھے فون پر اطلاع دینا"۔ خان صاحب نے کہا۔

رینہ صاحب نے معاملہ کو حل کرنے کی یقین دہانی کی اور رخصت ہو گے شیر خان بھی اپنی ناتوانی کی پریشانی بھول کر، خوشی کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا--

"خان صاحب کا یہ احسان میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سدا خوش و خُرم اور سلامت رکھے! ورنہ میں کہاں۔ اور کس لائق ہوں، ایک مفلس اور لاچار غریب پر خان صاحب نے مہربانی کی،--اس کا معاوضہ، نیک دعاؤں کے بغیر، میں انہیں کیا دے سکتا ہوں" شیر خان دل ہی دل میں خان صاحب کا شکریہ ادا کرتا رہا۔

رینہ صاحب اپنی سرکاری گاڑی میں سوار ہو گئے، اور شیر خان گاڑی کے انتظار میں سڑک کے کنارے کھڑا رہا۔

جب شیر خان رینہ صاحب کے دفتر میں پہنچا، تو وہاں پر لوگوں کی بھیڑ لگ چکی تھی۔ شیر خان نے دفتر کے باہر چپراسی سے رینہ صاحب کے متعلق پوچھا اور کہا کہ اسے ان سے ملنا ہے تو چپراسی نے یہ کہہ کر اسے انتظار کرنے کو کہا کہ رینہ صاحب دفتر کی ضروری فائیلیں دیکھ رہے ہیں۔ بہت دیر کے بعد شیر خان کو دفتر کے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ آداب بجالا کر شیر خان سامنے والے ٹیبل کے ایک طرف ہولیا۔ رینہ صاحب نے شیر خان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا--تو کہا--"خان صاحب تو تمہارے بارے میں مجھے کہہ تو گئے مگر میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ ساری اسامیاں پر کرلی

گئی ہیں اور اس طرح سے میں خود اس بارے میں بالکل بے بس ہوں۔ یہ ایک الجھا ہوا مسئلہ ہے۔ سرکاری کام کے کچھ قواعد و ضوابط ہوتے ہیں۔ انہیں کسی بھی طرح سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے"۔

"جناب! رحم کیجئے - مجھ غریب پر! بڑی امیدیں لے کر آیا ہوں۔ میرے اجڑے باغ میں بھی بہار آجائے ذرا مجھ پر ترس کھایئے"۔ شیر خان کی پُر نم آنکھیں اور التجا..........

"سنو میں نے پہلے ہی بتایا کہ میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں" رینہ صاحب نے کہا۔

"لیکن خان صاحب نے کہا تھا کہ اگر کوئی مشکل.........." ابھی شیر خان اپنا جملہ بھی پورا نہیں کر پایا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"ہیلو خان صاحب آداب! ہاں میں رینہ صاحب بول رہا ہوں۔ جناب ابھی اسے آرڈر دلوا دوں گا۔ ہاں وہ بھی یہیں دفتر میں موجود ہے-- آپ پورا یقین رکھئے" رینہ صاحب نے ٹیلیفون پر خان صاحب کو بتایا۔

یہ باتیں سن کر شیر خان کے تن بدن میں زندگی کی روح افزا لہر دوڑ گئی۔ رینہ صاحب نے گھنٹی بجا کر اپنے سکریٹری کو بلایا--- "سنو وہ جو خالی اسامیاں ہیں ان میں سے ایک کا تقرری کا آرڈر بنا دو۔ یہ اس کا بیوڈاٹا (Bio-Data) ہے اور یہ اس کے اسناد اور کاغذات"۔ سکریٹری کو رینہ صاحب نے ہدایت دی۔

دو گھنٹوں کے انتظار کے بعد شیر خان کے ہاتھ میں اس کی واحد امید-- اکلوتے بیٹے کی نوکری کا آرڈر تھا جسے وہ بار بار چوم رہا تھا۔ "اب ہمارے گھر میں بھی خوشی کے چراغ جلیں گے۔ غربت، بھوک اور ناداری سے نجات ملیگی۔ نئی بہار آئیگی، بزاز، دوائی فروش، سبزی فروش اور باقی لوگوں کا قرضہ ادا ہوگا۔ گھر جو سُونا سُونا پڑا ہے، اس میں بھی رونق آئیگی، پرویز کی شادی ہوگی تو گھر خوشیوں سے چہک اٹھے گا۔ پرویز کو کیا معلوم تھا کہ اس کا بوڑھا باپ بھی کسی دُھن کے پکّے سے کم نہیں-- میں بھی کہاں ہمت ہارنے والا تھا۔ آخر کار میری ہمت۔ اور کوشش بار آور ثابت ہوگئی۔ اور میں پرویز کا آرڈر حاصل کر کے ہی رہا"۔ شیر خان دل ہی میں سپنوں کے محل تعمیر کر رہا تھا۔

گھر پہنچ کر وہ سیدھے پرویز کے کمرے میں گیا، جہاں وہ سویا ہوا تھا، "پرویز-- اٹھو-- یہ دیکھو میں تمہاری نوکری کا آرڈر لے آیا ہوں"-- لیکن پرویز کچھ نہ بولا، شیر خان نے جب اس کے چہرے سے لحاف اٹھایا- تو وہ یہ دیکھ کر دھڑام سے فرش پر گر پڑا کہ پرویز ابدی نیند سو گیا ہے۔

محلوں نے چھین لیا.........

"بیٹی! ہم جو کچھ کر رہے ہیں تیری بھلائی کے لئے کر رہے ہیں۔ تمہاری زندگی خوش گوار ہو تو ہم بھی خوش رہیں گے۔ تم ابھی چھوٹی ہو اور ان باتوں کو سمجھ نہیں سکتی۔ تمہارے ڈیڈی جو کچھ سوچتے ہیں، وہ صحیح ہے۔ ہم نے تمہیں لاڈ پیار سے پالا ہے۔ تمہاری ہر خواہش کو پورا کیا ہے۔ ہمارا تو تمہارے سوا ہے ہی اور کون۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم ایسے گھر کی بہو بن جاؤ جہاں تمہیں ہر قسم کی راحت، آرام، اور گھر کا سا برتاؤ ملے۔ جہاں تم سدا خوش و خرم رہ سکو گی۔ کسی ایرے غیرے کے ہاتھ میں ہم تمہارا ہاتھ نہیں دے سکتے۔ بیٹی! تم خود ہی سوچو کہ اس میں تیرا ہی بھلا ہے نا"؟ رضیہ خاموشی سے اپنی ماں کی باتیں سن رہی تھیں ورنہ رضیہ ہمیشہ شام کے وقت اپنے ہی کمرے میں بیٹھتی تھیں"۔ رضیہ تم خاموش کیوں؟ بیٹی آج کی بار میں نے فیصلہ کر ہی لیا ہے اور میں نے تمہارے ڈیڈی سے بھی تمہارے ہاتھ پیلے کرنے کی بات کی ہے۔

ملک صاحب کا خاندان اونچا ہے۔ ایسے اونچی ذات کے لوگ ہر کسی کو نہیں

ملتے ہیں۔ اور پھر ان کے پاس عالی شان بنگلہ ، باغات ، موٹر کار ، --اور کیا کیا نہیں۔ لڑکا بھی تو لاکھوں میں ایک ۔ انجینیئر ہے اور اچھی خاصی تنخواہ کے علاوہ بالائی آمدنی کے طور پر ہزاروں روپیہ کماتا ہے۔ تم ہی بتاؤ کہاں ملے گا ایسا لڑکا اور ایسا گھر؟-- خیر میں تمہیں صرف یہ کہنے آئی ہوں کہ تمہارے ڈیڈی اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہاری منگنی چند ہی دنوں میں ملک صاحب کے فرزند مشتاق کے ساتھ ہو جائیگی۔ ہے نا بیٹی ٹھیک"!

ماں بیٹی کو سمجھا رہی تھی لیکن رضیہ .... اس کی آنکھیں پُر نم ہو گئیں۔ چہرہ پیلا پڑ گیا اور جسم سکڑنے لگا۔ "ممی -- ممی -- میں ابھی شادی نہیں کروں گی۔ ممی ..... پلیز۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو"۔ رضیہ ماں کے قدموں پر گر پڑی۔ "نادان بیٹی کیا ہوا ہے تجھے، عمر بھر یونہی یہاں نہیں رہنا ہے۔ لڑکیوں کو میکہ چھوڑ کر سسرال جانا ہی پڑتا ہے۔ تم تو خود لکھی پڑھی ہو تو خود ہی سوچ سمجھ لینا چاہیئے۔ ہم نے بھی ایسا گھر ڈھونڈا ہے جہاں تم راج کرو گی۔ ماں بیٹی سے کہے جا رہی تھی "آخر ہمارا بھی تم پر حق ہے۔ ہم نے تُمہیں پال پوس کر بڑا کیا ہے"

"لیکن .... ممی .... رضیہ نے بات کاٹ کر کہا......

"میں لیکن ویکن نہیں مانتی ہوں۔ ہم نے فیصلہ جو کیا ہے وہ کیا ہے۔ تم کیا جانتی ہو اچھے اور بُرے کی تمیز" یہ کہہ کر رضیہ کی ماں اندر چلی گئی اور رضیہ ...... رضیہ ہچکیاں کھانے لگی اور کہیں کھو گئی......

چار سال پہلے جب رضیہ نے کالج میں داخلہ لیا تھا تو ان ہی دنوں کی بات ہے۔ ایک لڑکے نے رضیہ کے سفید فراک پر سیاہی چھینکی تھی اور پھر اس پر سارا کلاس روم طلباء کے قہقہوں سے گونج اٹھاتا۔ لیکن ایک شریف النفس خوش شکل طالب علم نے اس لڑکے کی ملامت اور اسے تنبیہ کی تھی۔

یہ شریف النفس طالب علم شفیق تھا جو گاؤں کا ایک ذہین لڑکا تھا۔ یہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا، لیکن ماں کے سایۂ شفقت سے محروم تھا۔ اس کا باپ پیشے کے لحاظ سے ایک چھوٹا دکاندار تھا۔ اس کی جائیداد میں ایک چھوٹا سا رہائشی مکان اور تھوڑی سی کھیتی باڑی والی زمین تھی۔ شفیق کی شکل و صورت کسی شہزادے سے کم نہ تھی اور وہ ہمیشہ صاف و شفاف سفید اجلی اجلی سی قمیض اور اچھا کریز والا پتلون پہنتا تھا۔ اچھے بھلے کاموں میں ہمیشہ سب سے آگے ہوتا تھا، کھیل کود، بحث و مباحثہ، پڑھائی، مضامین لکھنے اور دیگر کاموں میں بھی وہ ہمیشہ اول آتا تھا، کسی بھی میدان میں پیچھے نہیں رہتا تھا، الغرض وہ جملہ اوصاف حمیدہ سے متصف تھا، انہی اوصاف اور کلاس میں پہلے ہوئے مخصوص واقعہ پر اس کے رد عمل نے رضیہ کے دل میں شفیق کے لئے عزت کی جگہ پائی تھی۔ یہی عزت آہستہ آہستہ محبت کی چنگاری میں بدل گیا جو بعد میں شعلہ بن گیا۔ رضیہ بھی کسی سے کم نہ تھی، اس کی بڑی بڑی آنکھیں، چہرے کی لالی، گلابی ہونٹ، لمبے لمبے بال، متناسب اعضا کے ساتھ

دل لبھانے والا قد -- شریف الطبع حیاداری -- یہ سب بذات خود ہر کسی کے لئے باعث کشش ہو سکتے تھے۔ اسی لئے کالج کے اکثر طلباء اسے عزت کے ساتھ چاہتے تھے۔ امیر گھرانوں کے لاڈلے بھی اس پر فریفتہ تھے۔ مگر کسی کو کیا معلوم تھا کہ وہ ایک غریب گھرانے کے ایک ذہین لڑکے کو اپنے دل میں سما چکی ہے۔ آخر پیار کا اظہار ہونٹوں پر آ ہی گیا۔ اور آشکارا بھی ہوا۔ قسمیں اور وعدے بھی ہوئے۔ عشق و محبت کے ہولناک نتائج کو فراموش کر کے بلکہ دانستہ نظر انداز کر کے دونوں انجانے خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں کھو گئے۔ سماج، رواج و رسم، غربت اور امیری کے اذیت ناک احساسات کے مایوس سایوں سے ہمیشہ دور رہتے ہوئے - وہ سپنوں کی دنیا میں اپنے شاندار مستقبل کا تانا بانا بنتے رہے۔

فائینل کا امتحان ختم ہوا اور طلباء و طالبات سبھی کالج کو الوداع کہہ کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ لیکن شفیق اور رضیہ چنار کے سایئے تلے محوِ گفتگو تھے۔

"رضیہ اب ہم کہاں -- اور کیسے ملا کریں گے؟ تم تو جانتی ہو کہ میں تمہارے بغیر ایک دن بھی گذارنے کا تصور نہیں کر سکتا ہوں۔ اب کیا ہوگا ہمارا" --- شفیق اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے رضیہ سے مخاطب تھا۔

"شفیق - تم بھی کتنے بھولے ہو، روزنہ سہی کم از کم ہفتے میں ہم ایک

بار تو مل سکتے ہیں۔ ویروار کو میں پبلک لائبریری جاتی ہوں۔ تم بھی وہیں آیا کرو۔ پہروں ملا کریں گے۔ اور ہاں ہم تو ایک دوسرے کو خط بھی لکھ سکتے ہیں" رضیہ کی باتیں سنکر شفیق کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے بعد دونوں کالج سے باہر آ کے الگ الگ اپنے گھروں کی طرف چلدیئے۔

ملنا جلنا حسب وعدہ جاری رہا، فائینل کا نتیجہ نکلا، دونوں پاس ہوگئے۔ رضیہ گھر پر ہی بیٹھی اور شفیق نے اپنے باپ کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ نوکری ملنے تک وہ باپ کے ساتھ کام کرے گا تاکہ کمائی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ بوڑھے باپ کا بوجھ بھی ذرا ہلکا ہو جائے۔

"رضیہ میں سوچتا ہوں کہ کہیں تمہاری امیری اور تمہارے محل ہمارے پیار کی راہ میں ناقابل عبور سمندر نہ بن جائیں؟ مجھے لگتا ہے کہ ہم دونوں کے بیچ سماجی رسم ورواج کی آہنی دیوار کھڑی ہے اور ہم دونوں اس کے سامنے بے بس ہیں"۔

شفیق رضیہ سے مخاطب تھا۔

"شفیق آج یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیوں ایسے منحوس خیالات اپنے دماغ پر سوار کرتے ہو، تم ابھی تک مجھے نہیں سمجھ سکے ہو، میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں کہ امیری میں بہک جاؤں، میری ماں اور ڈیڈی بھی ترقی پسند رجحانات رکھتے ہیں وہ قدامت پرستی اور سماجی بندشوں کو فرسودہ اور بیکار سمجھتے ہیں۔ میں آج ہی یہ کام انجام دوں گی، تم اس بارے میں خواہ مخواہ کی

پریشانی میں ابھی سے گرفتار نہیں ہو جانا۔ یہ میرا کام ہے، تم اپنے آپ کو تیار رکھو" یہ باتیں سنکر شفیق خوشی سے پھولے نہ سمایا، وہ اتنا خوش ہوا جیسے وقت نے ساری خوشیاں اس کے دامن میں لا کھ ڈالدی ہوں۔

شام کو جب رضیہ گھر پہنچی تو آج-- ماں نے خلافِ معمول اسے دالان پر بلایا تھا، اور شادی کا ذکر چھیڑا تھا۔ "میرے اللہ! میں کیا کروں۔ مجھ پر رحم کھا، میرے مولا! رضیہ دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اللہ سے دعا مانگ رہی تھی۔

"ممی"۔

"کیا بیٹی...... بتاؤنا-- کیا بات ہے"؟

"ممی...... مم...... ممی میں مشار ۔ تھ شادی نہیں کرونگی"

"کیوں- کیا بات ہے"؟

"ممی-- شادی تو مجھے ہی کرنی ہے نا؟ میری مرضی کے بغیر ہو نہیں سکتی۔ میرے بھی اپنے آپ کے کچھ حقوق اور فرض ہیں، جن سے میں اچھی طرح سے واقف ہوں۔ میں جاہل، ان پڑھ، نا سمجھ یا نابالغ نہیں ہوں کہ کوئی غلط قدم اٹھاؤں یا غلط فیصلہ کروں"

"بیٹی! تم کیا کہنا چاہتی ہو...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہے۔ کیا تم نے کسی لڑکے کو پسند کیا ہے اور اگر کیا ہے تو ہمیں بتاؤ وہ کون ہے۔ ہم بھی سوچیں گے۔ آخر یہ عمر بھر کی بات ہے، کوئی گڑیوں کا کھیل نہیں ہے"۔

"ہاں- ...... ممی ...... ممی ...... میں شفیق کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہوں"

"شفیق...... کون شفیق"؟

"ممی - وہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا اور میرے ساتھ ہی اس نے فائینل پاس کیا ہے۔ تم نے بھی تو اس کو دیکھا ہے۔ تمہیں یاد ہے نا ممی ؟-- جب تم ایک دن مجھے ملنے کالج میں آئی تھی اور ایک لڑکا تمہیں میرے پاس لایا تھا۔ اس نے تمہارے ساتھ تو بہت باتیں کی تھیں۔ اور تم نے بھی اس کی بڑی تعریفیں کیں۔ شریف، ذہین، حیادار" یہ باتیں سنکر رضیہ کی ماں پر جیسے بہت بڑا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

"ارے کیا ہوا ہے تجھے ؟ محلوں میں پلنے والی شہزادی کو ہم جھونپڑی میں بھیجدیں-- نہیں-- نانا، ایسا نہیں ہوگا کبھی نہیں ہوگا--نہ ذات کا-نہ خاندان کا، دوکوڑی کا نہیں ہم تو اس کے باپ کو بھی جانتے ہیں۔ ان کے پاس ہے ہی کیا؟ تمہارے ڈیڈی آتے ہی ہوں گے میں انہیں صاف صاف بتاؤں گی کہ اگلی ویروار کو تمہاری منگنی مشتاق کے ساتھ طے کردی جائے"۔

یہ کہہ کر ماں بیٹی دونوں کھڑی ہو گئیں اور اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں۔

"کیا بات ہے ابا؟ آپ نے مجھے کیوں بلایا"۔ شفیق اپنے باپ کے سامنے کھڑا تھا۔ تم تو دیکھ ہی رہے ہو کہ میں اپنی زندگی کے آخری دن گذار رہا ہوں۔ اور نہ معلوم کب آخری گھڑی آئیگی زندگی پر کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ اور موت کا کوئی مقررہ وقت نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے

بعد بھی اس گھر کا چراغ جلتا رہے۔ تم پڑھے لکھے، سمجھدار ہو، میری تمنا ہے
کہ تم اپنی شادی کا انتظام خود کرلو۔ یہ کام تو میرے کرنے کا تھا، لیکن میں
کمزور ہوں اور اب یہی خواہش ہے کہ جلدی سے اپنی بہو کو دیکھوں"۔ باپ
بیٹے سے مخاطب تھا اور بیٹا خاموش سر جھکائے حیاو شرافت کا مجسمہ بن کر
سامنے کھڑا تھا۔

"میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایسا باپ ملا ہے۔ جب رضیہ سنیگی تو وہ
کتنی خوش ہوگی۔ ہاں!...... ہاں میں ابھی اسے لکھوں گا"شفیق نے کمرے میں
آکر قلم اٹھایا ہی تھا کہ باہر سے ڈاکیہ خط لے کر آیا اور پکارا"شفیق صاحب
کے نام خط ہے"

شفیق نے خط کھولکر پڑھنا شروع کیا:۔

"میرے شفیق!

میں کن صبر آزما اور روح فرسا حالات سے دوچار ہوں، نہ لکھنے کا
یارا ہے، نہ تحریر اس کی متحمل ہوسکتی ہے مختصر بات یوں ہے کہ
تم سے ملنے کے بعد فوراً ہی ممی نے مجھے ڈالان میں بلایا اور کہا کہ
تیری منگنی کا معاملہ کسی انجینئر مشتاق کے ساتھ طے کیا جانا زیر
غور ہے۔ وہ خاندانی بھی ہے اور امیر زادہ بھی۔ شفیق! میں بے وفا
نہیں ہوں میں ان تمام بندھنوں کو توڑ کر تمہارے پاس آؤں گی
میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔ جو تم چاہو میں وہی کروں گی۔

مجھے فوراً لکھدو۔ میں بے چینی کے ساتھ تمہارے خط کا انتظار کروں گی۔

فقط تمہاری

رضیہ"

شفیق کے چہرے کا رنگ ہی اتر گیا اور وہ دم بخود ہو کے رہا لیکن جذبات پر قابو رکھنے میں وہ کامیاب ہوا۔

"رضیہ

تمہارا خط ملا۔ سب کچھ جان گیا۔ ویسے یہ کوئی غیر متوقع بات تو نہیں تھی- اور نہ اب ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم مشتاق کے ساتھ شادی کرلو۔ تمہارے والدین کا تم پر حق ہے۔ وہ جو چاہتے ہیں وہی کرلو، اور ہوگا بھی وہی۔ میں تمہارے گھر والوں اور خاندان کے لئے پریشانی کا باعث نہیں بننا چاہتا ہوں اور سب سے بڑی بات یہی ہے کہ میں ایک غریب باپ کا بیٹا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم باضمیر، اور خدا پرست لوگ ہیں، باقی میرے دل میں سدا تمہاری عزت رہیگی، میری فکر نکرنا

نہ غم کو میں نے غم سمجھا نہ دیکھی ہے خوشی میں نے
کہ جن حالات میں گذری گذاری زندگی میں نے
بڑی دلکش سنی تھی داستان زندگی میں نے
مگر نزدیک سے دیکھا تو پایا عارضی میں نے

خدا حافظ !۔۔ شفیق"

دن گذرتے دیر نہیں لگتی ہے، رضیہ اور مشتاق کی شادی ہو گئی محل
بجلی کے قمقموں سے چمک اٹھے، دونوں گھروں میں ہر طرف خوشیاں ہی
خوشیاں تھیں، دونوں گھرانے فرط مسرت سے سر شار، لڑکی والوں کو انجینیئر
ملا، اچھا گھر، اور اعلی خاندان ملا، اور لڑکے والوں کو جہیز میں موٹر کار، کلر ٹیلی
وژن لاکھوں روپیہ کے زیوارت اور ملبوسات اور نجانے کیا کیا ملا۔

آخر مادی ساز و سامان نے اپنا رنگ دکھا ہی دیا۔ شادی کو ہوئے
پورے تین سال بیت گئے اور ایک دن رضیہ اپنی ماں کے سامنے بیٹھی کہے
جا رہی ہے "ممی اب میں سسرال نہیں جاؤں گی۔ وہ روز مجھے طعنے دیتے ہیں
کہاں ہے بنگلہ اور کہاں ہے وہ رقم جو دینے کا وعدہ کیا گیا تھا، ممی وہ ظالم ہیں،
مشتاق کو انگلینڈ جانا ہے اور مجھے یہ کہہ کر یہاں روانہ کیا ہے کہ میں یہاں سے
اس کے لئے ایک لاکھ روپیہ لے آؤں۔ ممی تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں"؟

"بیٹی تمہیں تو خود اچھی طرح سے معلوم ہے کہ جس وقت ہم نے
تمہاری شادی انجام دی تھی اس وقت حالات بہت ساز گار تھے۔ تنخواہ کے
علاوہ مختلف ذرایع سے روپیہ وصول ہوتا تھا، مگر آج وہ حالات ہی نہیں
رہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم نے بنگلہ کے علاوہ اور کچھ رقم بھی دینے کا وعدہ کیا تھا،
لیکن جب سے تمہارے ڈیڈی کو سرکار نے نوکری سے برخاست کر دیا ہے۔
جب ہی سے ہمارے حالات بھی بگڑتے جا رہے ہیں۔ پھر بھی ہم نے انہیں

کار، کلر ٹیلی وِژن، لاکھوں روپیہ کے زیورات وغیرہ جہیز میں دیدیئے وہ کیا کچھ کم تھا۔ خیر بیٹی! تم اس وقت جاؤ اور اپنے شوہر مشتاق کو خود سمجھاؤ۔ دیکھو لو۔ وہ کیا کہے گا" ماں نے اپنی پیاری بیٹی کو دعائیں دیتے ہوئے سسرال واپس بھیجدیا۔

"انسپکٹر صاحب! میرا پورا یقین ہے کہ میری بیٹی کو تنگ کر کے اسے سسرال والوں نے زہر کھانے پر مجبور کیا ہے۔ اس نے زہر کھالی ہے۔ کیوں کہ سسرال والے اسے مزید جہیز نہ لانے کے طعنے دیتے رہتے تھے، اور اس طرح سے انہوں نے اس کا جینا وبال جان بنایا تھا" رضیہ کا باپ پولس انسپکٹر سے بیان کر رہا تھا جو ہسپتال میں زیر علاج اپنی زہر خوردہ بیٹی کے بارے میں پولس کے سامنے بیان درج کروا رہا تھا۔

انسپکٹر نے فوراً ہسپتال کا رخ کیا۔ وہاں ڈاکٹر سے معلوم ہوا کہ زہر خوردہ لڑکی کا اسٹامک واش کیا گیا ہے۔ لیکن اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں کہی جاسکتی۔

۔پولس انسپکٹر تھوڑا آگے بڑھا اور لڑکی کے چہرے سے اس نے جونہی پردہ اٹھایا وہ ہکابکارہ گیا۔

"رضیہ" انسپکٹر کے منہ سے لاشعوری طور پر یہ نام نکلا، رضیہ نے لمحہ بھر کے لئے آنکھیں کھولیں اور انسپکٹر کی طرف ایک لمبی نظر ڈال کر کہا "شفیق! میں جارہی ہوں ہمیشہ کے لئے خداحافظ!" اور یہ کہتے ہوئے دم توڑدیا۔

انسپکٹر شفیق کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے --اور باہر ریکارڈ بج رہا تھا، محلوں نے چھین لیا بچپن کا پیار مرا.........

"دردِ پنہاں"

"روحی تم ابھی تک تیار نہیں ہو پائی ہو، سوا نو بج چکے ہیں۔ ٹیکسی باہر کب سے کھڑی ہے۔ اٹھو۔ جلدی کرو اور کپڑے بدل دو، تب تک میں باتھ روم سے آتا ہوں"۔ جلیل اپنی شریک حیات سے کہہ رہا تھا۔ میاں بیوی پہلگام جانے والے تھے اور اسی سلسلے میں تیاری ہو رہی تھی۔ شادی کی پہلی برسی پر انہوں نے پہلگام جانے کا پروگرام بنایا تھا، روحی آہستہ آہستہ اٹھی اور تیاری کرنے لگی۔ پیلے رنگ کا فراک، کالا پاجامہ ہلکے پیلے رنگ کے نازک پرنٹ کے چھوٹے چھوٹے پھولوں والا، اور اسی لباس کے ساتھ میچ کرنے والی ساڑی -- اور سینڈل، آہوانِ صحرا کو مات دینے والی سرمئی آنکھیں، ہیرے کا جگر کاٹنے والے گلاب کی پتیوں جیسے سرخ، نازک اور نرم ہونٹ، لمبا لمبا سا قد، الھڑپن لئے ہوئے روشن چہرہ اور ہنس کی جیسی گردن پر کالے کالے لمبے لمبے زلف بنگال -- فیاض ازل سے عطا شدہ معصوم حُسن -- اور بھی نکھر آیا۔ لگتا تھا کہ ابھی ابھی ثریا سے کوئی شہزادئ فلک اتر آئی ہے۔ برقعہ پہن کے وہ اپنی ساس سے اجازت لینے گئی۔ ساس خاموش رہی۔ جب

روحی نے اس سے پھر ایک بار اجازت مانگی تو ساس بہو پر برس پڑی "جاتی کیوں نہیں ہو۔ جاؤ۔ اب مجھ سے پوچھنے کیوں آئی ہو؟ تم تو پہلے ہی سے بن ٹھن کے تیار ہو گئی ہو۔ جلیل نے تجھے سر چڑھایا ہے میکے میں تانگے کا نام بھی نہیں جانتی تھی اور یہاں ٹیکسی میں جا رہی ہو"۔

روحی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ "روحی دیر ہو رہی ہے آ جاؤ نا، جلدی کرو" جلیل کی آواز سنتے ہی روحی نے جلدی جلدی سے آنسو خشک کر کے باہر کا رخ کیا۔

"روحی تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم اداس سی لگتی ہو، موڈ خوشگوار بنا ڈالو"۔ جلیل نے سوالیہ انداز میں دیکھ کر روحی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں - کوئی بات نہیں۔ ہاں اگر اماں جی بھی ہمارے ساتھ آتیں تو کتنا اچھا ہوتا" روحی نے کہا۔

"تمہیں تو بخوبی معلوم ہے کہ میں نے اماں جی سے خود بھی کئی بار آنے کے لئے کہا تھا۔ مگر اس نے نہیں مانا دراصل اس کا مزاج ہی ان تفریحوں سے برگشتہ ہو چکا ہے۔ پھر میں کیا کر سکتا تھا۔ اور ہاں تمہیں تو اس نے خوشی خوشی اجازت دیدی ہے، چلو پھر کبھی اسے اپنے ساتھ لے ہی چلیں گے"۔ جلیل نے روحی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

دونوں گاڑی میں سوار ہو گئے۔ اور گاڑی فراٹے بھرتے ہوئے پہلگام کی طرف رواں دواں ہو گئی۔

"یہ لہلہاتے سبز کھیت اور کھیتیاں، نیلا نیلا اور اجلا اجلا آکاش سر سبز روشیں، دوڑتے ہوئے ندی نالے، پہاڑوں کے دامن میں بل کھاتی ہوئی -- پر پیچ سڑک، آسمان کو چھوتے ہوئے سرو، دیودار اور قطار اندر قطار سفیدے کے درخت، گھنی گھنی، گول مٹول جھاڑیاں، پہاڑوں کے سروں پر صاف و شفاف اور چمکتی ہوئی برف کی دستاریں، اوپر اونچائیوں سے پگھلتی ہوئی چاندی جیسے صاف و شفاف پانی کے تیز بہنے والے جھرنے، -- اور پھر ماشاءاللہ اس وسیع و عریض فضا میں رنگا رنگ قدرتی پھولوں کی پر لطف بھینی بھینی خوشبو سے لدی ہوئی پُروائیاں، ادھر دیکھ! پہاڑ کا ایک حصہ دھوپ نے سنہرا بنا رکھا ہے، اور دوسرے حصے کو چھاؤں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، یہ نور و ظلمت کا سنگم لگ رہا ہے۔ روحی! دیکھو! یہ شوقین سیاح اور سیلانی۔ گرم علاقوں کے شدید گرم موسم کے جھلسائے ہوئے، لوگ، لدر دریا کے تیز بہتے ہوئے، پتھروں سے ٹکراتے ہوئے پانی میں کود کر کھیل رہے ہیں اور موج منا رہے ہیں ؎

پانی تیرے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب

مرغان سحر تیری فضاؤں میں ہیں بے تاب

"روحی! ذرا سنبھل کے، ہوش سے چلو! اگر تمہارا پیر پھسل جاتا تو سیدھے دریا میں گر جاتی، تم آج تک کتنی بار یہاں پہلگام آئی ہو؟ جلیل نے

پوچھا۔

روحی کسی گہرے سوچ میں تھی اور نہ جانے اس کے ذہن میں کن خیالات کے ہجوم نے تلاطم اٹھایا تھا، اور وہ اندر ہی اندر من میں، اس طوفان کو زیر کرنے کی کوشش میں مصروف تھی، وہ سکوت کی گہرائیوں سے چونک کر--- آہستہ سے بولی ''دوسری بار''۔

''صرف دوسری بار--- ارے میں تو یہاں ہر سال آتا رہتا ہوں'' جلیل نے تعجب کے انداز میں روحی کو مخاطب کیا۔

جلیل وادیٔ جنت نظیر کی ایک مشہور و معروف بستی کا رہنے والا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب اس کے والد صاحب یہاں ضلع کے دفتر میں محکمہ مال کے ایک ذمہ دار آفیسر کی حیثیت میں تعینات ہو کے آئے تھے۔ جلیل ان کا فرزند تھا، اس نے بھی یہیں کالج میں بی اے کے سال اول میں داخلہ لے لیا۔ جس کوٹھی میں وہ یہاں قصبہ میں رہائش پذیر تھے اس کے پڑوس ہی میں بالکل نظر کے سامنے ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ جس میں ایک نرس رہتی تھی۔ جو عہد شباب میں بیوہ ہو گئی تھی۔ اس کے اس چھوٹے سے گھر میں اس کی اکلوتی بیٹی روحی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ روحی بھی کالج میں پڑھ رہی تھی، اور اس کی ماں اس کے ڈاکٹر بننے کا خواب دیکھ رہی تھی، شکل و صورت سے روحی بے مثال تھی اور ذہانت اور قابلیت کے لحاظ سے بھی اول درجے کی تھی۔

جون کا مہینہ تھااور موسم خاصا گرم تھا، جسم دھوپ کی تمازت سے پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ تیسرا گھنٹہ لگنے کو ہی تھا کہ چند طلباء پرنسپل کے دفتر کے سامنے جمع ہو گئے۔ کالج کے باہر کوئی بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ جو ہوتے ہوتے کالج کے اندر بھی پہنچ گیا۔اور دیکھتے ہی دیکھتے کالج میں بڑی اسٹرائیک ہو گئی۔ طلباء نے کالج سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ لیکن پولیس نے ان کے باہر جانے کے تمام راستے بند کر دیئے۔ طلباء نے کالج کے اندر کا محاذ سنبھال لیا، گراونڈ میں پھیلی ہوئی اینٹوں کے ڈھیر،اور پتھر، پولیس پر پتھراؤ کرنے کے لئے بڑی تیزی کے ساتھ کام میں لائے گئے۔ پولیس نے جوابی کارروائی کے طور پر، پولیس لائن میں موجود ٹیر گیس گولوں کا سارا ذخیرہ اس مہایدھ میں جھونک دیا۔اور طلباء بھی خشمناک ہو کے پورے کالج گراونڈ میں پھیل گئے۔اس دوران میں پولیس نے کالج کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ پھر کالج میں داخل ہوتے ہی --- بے تحاشا طلباء پر لاٹھی چارج کرنا شروع کیا، درجنوں طلباء مجروح ہو کر گراونڈ میں گر پڑے۔اور پولیس ان کو ڈنڈوں سے پیٹتی رہی۔ ہر طرف دارو گیر کا عجیب ماحول برپا ہو گیا۔ جلیل بھی اسی افراتفری کے عالم میں تھا، پولیس کا غضب ناک اور بھپرا ہوا روپ دیکھ کر وہ ایک دم گرلز روم کی طرف دوڑا پڑا،اور دروازے پر گر پڑا، وہاں گرلز روم میں چند طالبات تھیں،انہوں نے جلدی جلدی دروازہ کھولا اور جلیل کو اندر لے آئیں۔ جلیل کی آنکھیں اشک آور گیس لگنے سے بند ہو گئیں تھیں۔

ایک لڑکی نے اپنی ساڑھی پھاڑ کے اسے گیلا کر کے جلیل کی آنکھوں پر رکھدیا چند منٹ کے بعد جلیل کی آنکھیں کھل گئیں۔ روحی اور دوسری طالبات کو اپنے سامنے پاکر وہ حیران ہو گیا۔ روحی کی پھٹی ہوئی ساڑھی دیکھ کر جلیل دل ہی دل میں ایک جذبۂ ممنونیت و احسان مندی لئے ہوئے، شرمندگی محسوس کرنے لگا، اِدھر اُدھر دیکھ کر اس نے جو باہر نکلنے کا ارادہ کیا تو روحی نے اسے یہ کہہ کر باہر جانے سے روکا کہ "ابھی بھپری ہوئی پولیس فورس کالج کے اندر موجود ہے۔ اور بہت سارے طلباء کو گراونڈ میں سے ہی پکڑ کر، بلکہ گھسیٹ کر لے گئی ہے"۔

کچھ دیر کے بعد حالات کچھ کچھ نارمل ہونے لگے، طلباء بھی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں، ڈرتے ڈرتے، کالج سے باہر نکلنے لگے، جب حالات ذرا قابو میں آگئے تو جلیل بھی کالج سے باہر آگیا اور وہاں سڑک پر اپنے والد صاحب کی جیپ کو آتے دیکھا اور فوراً ہی اس میں سوار ہو کر گھر کی طرف روانہ ہوا۔

اسٹرائیک کا ہنگامہ بھی بُجھ گیا، اور پرانی یادیں بھی حافظہ سے اترنے لگیں، لیکن جلیل، روحی کا یہ احسان اپنے دل سے نہیں بھلا سکا اور اسی احسان نے اس کے دل میں روحی کے لئے محبت پیدا کر دی۔ فرسٹ اِیر کے امتحانات کا نتیجہ نکلا، جلیل کو کمپارٹمنٹ آگیا، اور روحی فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو گئی، مگر روحی کے پاس نہ سفارش تھی نہ دھن، جو اس کے کام آتا۔ وہ

ڈاکٹری ٹریننگ کے لئے منتخب نہیں ہو سکی، اس نے کلیجے پر پتھر رکھ کر حالات سے سمجھوتہ کرلیا، اور تعلیم جاری رکھی دن گذرتے گئے اور مہینے اور سال بھی۔ دو سال بعد بی ایس سی فائینل کا نتیجہ نکلا، اور دونوں جلیل اور روحی پاس ہو گئے، اسی دوران جلیل کے والد کی ترقی ہو گئی، اور ان کی پوسٹنگ دوسرے ضلع میں ہوئی، جلیل کو بھی نوکری ملی اور وہ جنگلات کے محکمے میں رینج آفیسر کے عہدے پر تعینات ہو گیا۔ لیکن روحی نوکری کے لئے ترستی رہی۔ جلیل کی پوسٹنگ اتفاق سے روحی کے قصبے میں ہی ہوئی، اس وجہ سے دونوں - کبھی کبھار ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ اتفاقات نے جلیل اور روحی کی شناسائی کو محبت میں تبدیل کیا، اور آخر کار شجر محبت بار آور ہوا، جلیل نے روحی کو اپنی شریک حیات بنانے کا مصمم ارادہ کیا۔ اسی دوران جلیل کے والد صاحب صحت کے لحاظ سے چاق وچوبند ہونے کے باوجود، ایک دن اچانک رحلت کر گئے۔ اور اس طرح گھر کی تمام تر ذمے داریاں --- جلیل کے کندھوں پر آپڑیں۔ اس کی شادی کی زیر غور تجویز معرض التوا میں پڑ گئی، والد کی ناگہانی موت کی وجہ سے بھی اس کا دل بجھ سا گیا تھا، اس لئے وہ بھی شادی کے خیال سے رک سا گیا۔ لیکن اپنی والدہ کے اصرار اور اس کی خواہش کو مد نظر رکھ کر اسے آخر سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔ وہ دن تو اب آ ہی گیا، جب جلیل نے اپنی خواہش کی تکمیل کی اور روحی کو اپنے گھر دلہن بنا کر لے آیا۔

ابھی شادی کو چند ہی مہینے ہو گئے تھے۔ کہ روحی کی والدہ اللہ کو پیاری ہو گئیں، اس نے اپنی تمام ذمہ داریاں پوری کر کے ہی اپنی جان، جان آفریں کے حوالے کی، اور اس طرح سے روحی کی دنیا خاوند اور ساس تک ہی محدود ہو کر رہ گئی۔

شادی کی پہلی برسی پر دونوں میاں بیوی آج پہلگام گئے تھے۔ اور دن بھر کی تھکا دینے والی سیر و تفریح کے بعد رات دیر گئے واپس گھر پہنچے۔ کسی ضروری کام سے جلیل کو الٹے پاؤں گھر سے کہیں اور جانا پڑا۔ روحی نے کپڑے تبدیل کر کے کھانا پکانا شروع کیا۔ اس کی ساس اپنے آفیسر خاوند کے بے وقت موت سے زیادہ، کڑھی ہوئی تھی ہی اور اب جلیل کے روحی کے ساتھ زیادہ دل چسپی سے وہ اور بھی چڑھ نے لگی تھی۔ وہ ہر بات پر اپنی نئی بہو کو ٹوکتی اور کوستی رہتی تھی۔ آج صبح پہلگام جاتے وقت اور پھر دیر سے آتے وقت بھی وہ اس پر برس پڑی۔ وقت گذرتے گذرتے اس کا یہ چڑچڑا پن اپنی بہو سے نفرت میں بدل گیا۔ اور وہ اب اپنی بہو سے شدید نفرت کرنے لگی۔ پانچ سال گذر گئے اور ابھی میاں بیوی اولاد کی نعمت سے محروم ہیں۔ ڈاکٹروں نے صلاح دی ہے کہ روحی کو ریاست سے باہر لے جا کر ایک مشہور ہسپتال میں خصوصی اوپریشن کے عمل سے گذرنا پڑے گا، تب ہی وہ بچہ جننے کے قابل بن سکتی ہے۔ جلیل نے فیصلہ کیا کہ متوقع ترقی کا آرڈر حاصل ہونے کے فوراً بعد ہی وہ اپنی بیگم روحی کو خصوصی علاج معالجہ کے لئے

ریاست سے باہر لے جائیگا۔

آج شادی کی پانچویں برسی تھی، اس بار گھر میں یا گھر سے باہر کوئی بھی خصوصی پروگرام نہیں تھا، جلیل آج بھی دفتر گیا۔ گھر میں صرف اس کی ماں اور اس کی بیوی تھی۔ روحی کے چہرے پر خوشی اور امید کے دُھند لکے نشان بھی نظر نہیں آتے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں پنکھے کی خشک ہواؤں میں پڑی، کسی گہری سوچ میں پڑی تھی۔ اسی لمحہ اس کی ساس کمرے میں کھٹاک سے دروازہ کھولتے ہوئے داخل ہو گئی، ور بہو پر برس پڑی، ''تم یہاں موج اڑا رہی ہو، پنکھے کے نیچے، رانی بن گئی ہو، تکیہ لگا کر، بیٹھی ہو، تم تو ڈاین ہو، تم نے میرے بیٹے کی زندگی تباہ کر دی۔ اس کی ساری خوشیوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ اس کے دل کی کلی کو کھلنے سے پہلے ہی مَسل کے رکھ دیا ہے۔ جلیل کے بھی کوئی بچہ ہوتا تو وہ آج اتنا افسردہ دل کیوں ہوتا۔ آج-- ہاں آج آنے دو اسے، میں اسے صاف صاف بتادوں گی۔ وہ تو ابھی جوان ہے، اس کا کیا بگڑا ہے؟، میں اس کے لئے حور جیسی دلہن لاؤں گی، اور تم سے اُسے ہمیشہ کے لئے نجات دلاؤں گی۔ اور اس سے پہلے کہ تم میرے بیٹے کو تباہ کر دو-- میں اُسے ہمیشہ کے لئے تیرے منحوس سایے سے چھٹکارا دلاؤنگی''۔

''روحی! اٹھو-خوش ہو جاؤ! یہ دیکھو میرے ہاتھ میں کیا ہے؟ تم نے سوچا ہوگا کہ جلیل آج شادی کی پانچویں برسی پر دفتر کیوں گیا؟۔ میں تمہیں Surprise سرپرائیز دینا چاہتا تھا۔ میری ترقی ہو گئی ہے اور ہم

دونوں اگلے ہفتے ریاست سے باہر جارہے ہیں تاکہ تمہارا اوپریشن ہو سکے اور ہماری زندگی میں مسرتوں کے پھول کھِل اٹھیں۔ اٹھو۔روحی اٹھو" جلیل بڑی خوشیاں لے کر روحی کو سرپرائیز دے رہا تھا۔ لیکن روحی اسے، اس سے بھی بڑا سرپرائیز دے گئی تھی۔ اپنے دل میں ایک دردِ پنہاں لئے وہ ہمیشہ کے لئے سو گئی تھی۔

"یادِ ماضی"

"سارے شہر میں مکمل کرفیو لگا ہوا ہے، پولیس اور نیم فوجی دستے سڑکوں پر گشت کر رہے ہیں۔ ایک ہی رات میں تمام شہر کا پورا نقشہ ہی بدل گیا۔ کل جہاں رونق تھی، بھیڑ بھاڑ تھی۔ راگ و رنگ، ناچ و نغمہ اور رقص و سرود کی طرب افزا محفلیں گرم تھیں، وہاں آج ویرانی ہی ویرانی ہے، سڑکیں سنسان ہیں۔ بازار مکمل بند ہیں اور لوگ اپنے اپنے گھروں کے اندر دبک کے بیٹھے ہیں۔ سارا شہر کھنڈر لگ رہا ہے جہاں اُلّو بولتے ہیں۔ نہ معلوم کتنے لوگ مارے گئے، کتنے زخمی ہوگئے، اور کتنے گرفتار کئے گئے، کتنے گھر جلے، کتنی دکانیں لوٹ لی گئیں اور کتنی عصمتوں کو تار تار کیا گیا، انسانوں نے درِندوں اور وحشی حیوانوں کا روپ دھار لیا۔ بھائی ویسے تو یہ شہر ہمیشہ سے امن و آشتی اور آپسی بھائی چارے اور فرقہ وارانہ میل ملاپ کا گھوارہ مانا جاتا تھا۔ یہاں آج تک کبھی بھی کوئی دنگا فساد کا واقعہ رونما نہیں ہوا۔ مگر نہ جانے آج اس امن کے شہر کو کس شیطان اور عفریت کی نظر لگی، شہر میں جونہی یہ خبر پھیل گئی کہ ایک ہندو لڑکا ایک مسلمان لڑکی کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔ ہر

طرف آگ سی لگ گئی۔ دونوں فرقوں کے لوگ مشتعل ہو گئے، مسلمان دکانیں بند کرانے اور ہندو انہیں کھلا رکھوانے پر تلے ہوئے تھے۔ بس اتنا ہی کافی تھا۔ پتھراو، لوٹ مار، آتش زنی، شروع ہو گئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ہی سارا شہر فرقہ وارانہ فساد کی لپیٹ میں آ گیا۔ نہ جانے اب حالات کب سدھریں گے" مالک مکان مجھے شہر کے حالات سے واقف کر رہا تھا۔

"اور ہاں بھئی! گھر سے باہر قدم رکھنے کی کوئی غلطی نہیں کرنا پولیس نے تو پہلے ہی دیکھتے ہی گولی مارنے کا اعلان کیا ہوا ہے۔ اور پھر ہمارے سامنے والی گلی میں دوسرے فرقے کے لوگوں کی اکثریت ہے۔ ان سے بھی خطرہ متوقع ہے۔ کیا زمانہ ہے کہ ایک تو ہمارے فرقہ ہی کی لڑکی کو اغوا کر کے لے گئے اور پھر ہمیں ہی قتل و غارت گری لوٹ مار، اور آتش زنی کا شکار کیا جا رہا ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ حاکم اور پولیس بھی ان ہی کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اب ہماری کون سنے گا"۔

میں چپ چاپ مالکِ مکان کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ شہر کے اس روح فرسا واقعہ نے میرے دل و دماغ میں کونسے طوفان برپا کئے، ماضی کی ان جان لیوا یادوں کے زخم آج پھر ہرے ہو گئے جنہیں مرُورِ ایام نے بڑی مشکلوں سے کچھ کچھ مندمل کیا تھا، تلخ یادیں -- نہایت ہی تلخ یادیں...... ہولناک ماضی کی تلخ ترین یادیں دل و جگر کو کرید کرید کر ستانے لگیں۔

پندرہ برس پہلے میں اس شہر میں، ہزاروں میل دور دوسری ریاست میں واقع ایک گاؤں سے مجبوراً ہجرت کر کے آیا تھا۔ گاؤں میں ہمارا ایک چھوٹا سا گھر تھا، جہاں میں اور میرے والد صاحب رہتے تھے۔ ماں تو مجھے بچپن ہی میں چھوڑ کر جنت کو سدھار گئی تھی۔ ہمارے گاؤں کی آبادی تقریباً دو ڈھائی ہزار انسانوں پر مشتمل تھی، اور وہاں ہندو، مسلمان اور عیسائی - تینوں مذاہب کے ماننے والے لوگ رہتے تھے۔ اگر کوئی اجنبی ہمارے گاؤں میں آتا تھا تو وہ تینوں فرقوں کے لوگوں میں کوئی بھی فرق نہیں کر سکتا تھا۔ ایک ہی لباس، اور شکل و صورت یکساں قسم کے مکان اور بود و باش، یکساں قسم کے پیشے اور کاروبار اور مجموعی طور پر ایک ہی سماج۔ سب ہی لوگ ایک ہی مالا کے دانے تھے۔

ہمارے چھوٹے سے گھر کے بازو میں ہی میرے والد صاحب کے دوست پنڈت سدرشن کا چھوٹا سا مکان بھی تھا۔ سدرشن جی تو بہت پہلے پرلوک سدھارے تھے اور اب ان کے پریوار میں ان کی بیوہ راگھوی، ان کا بیٹا ویر اور ان کی بیٹی وینا، -- موجود تھے۔ ویر تو میرا کلاس فیلو تھا اور بچپن اور لڑکپن ہم دونوں نے یک جان و دو قالب کے مصداق ایک ساتھ گذارا تھا۔ ہمارے گھر اور سدرشن جی کے گھر کے تعلقات اور قربت سارے گاؤں میں ضرب المثل کے طور پر فخراً بیان کئے جاتے تھے۔ گاؤں میں یہ بات ہر عام و خاص کی زبان پر تھی کہ سدرشن کی موت پر، میرے والد صاحب نے ویر کو

اپنی گود میں اٹھا کر، سدرشن جی کی چتا کو آگ لگائی تھی، کیوں ویر تو بہت ہی چھوٹا بچہ تھا۔ سدرشن کی ساری جائیداد زمین اور مکان کی دیکھ بھال بھی میرے ہی والد صاحب کرتے رہے۔ ہمارے گھروں میں ایک دوسرے کے تیوہار اور بڑے دن، ایک ساتھ مل کر منائے جاتے تھے۔ ہمارے قلب و ذہن ایک دوسرے کی محبت سے سرشار تھے، تعصب، بھید بھاؤ، فرقہ پرستی، اور چھوت چھات تو سارے ماحول میں کہیں بھی موجود نہیں تھا، کہنے کو تو ہم دو الگ الگ چار دیواریوں میں رہتے تھے، لیکن لگتا تھا کہ ہمارا ایک ہی مشترکہ گھر تھا۔

وؔیر اور میں نے فائینل کا امتحان دیا تھا اور وؔینا نے بارھویں کا امتحان دیا تھا، میری قسمت نے عجیب موڑ لے لیا۔ میرے والد صاحب مختصر سی علالت کے بعد انتقال کر گئے میری مختصر سی دنیا اور سکڑ کر رہ گئی، میں تنہا ویرانیوں کا شکار ہو گیا۔ اس موقعہ پر۔ مجھے پوری طرح سے یاد ہے کہ ویر بھائی، بہن وینا اور ان کی ماں راگھوی جی نے مجھے کتنا دلاسا دیا اور اپنی پیار بھری موجودگی سے میری تنہائی کی تکلیف کو بہت حد تک کم کیا۔ ان کے خلوص بھرے پیار اور شفقت نے مجھ میں جینے کا حوصلہ پیدا کیا اور میں نے مشکلات پر قابو پاتے پاتے اپنے آپ کو حالات کے سانچے میں ڈھالا۔

بی اے فائینل کا نتیجہ نکلا، ہم دونوں۔ ویر اور میں، پاس ہو گئے دونوں ملازمت کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ جہاں سے بھی کوئی

اشتہار، ملازمت کے لئے نظر آتا تھا، ہم درخواست بھیج دیتے۔ فارم پر کرنا ہوتا، تو وہ بھی کرتے تھے۔ ویر کو آخر ریاست سے باہر۔ کہیں کوئی نوکری مل ہی گئی۔ اور وہ ریاست سے باہر گیا۔

"سنو پیارے! تم نہ صرف میرے کلاس فیلو، دوست ہو، بلکہ میرے بھائی بھی۔ میں تو اب نوکری کے سلسلے میں گھر اور ریاست سے باہر جا رہا ہوں۔ میں اپنی ماں اور بہن کو تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ ان کی دیکھ بھال، خبر گیری، اور خدمت کرنا تمہارا بھی فرض بنتا ہے۔ جس طرح ہمارے والدین نے بھائی چارہ اور دوستی نبھائی ہے۔ اس کی لاج رکھنا ہم دونوں پر فرض ہے۔ ہم اس روایت اور پرمپرا کو پروان چڑھائیں گے۔ میری ماں اور بہن وینا کو روپیہ کی کوئی فکر نہیں ہوگی وہ تو میں ہر مہینہ وقت پر ان کو بھیجتا ہی رہوں گا۔ اور پھر تو میں بھی خود سال میں ایک دوبار گھر تو آتا ہی رہوں گا۔ وینا کے ہاتھ پیلے کرنے کا وقت بھی تیزی کے ساتھ آرہا ہے۔ اپنی غیر حاضری میں، ان کی خبر گیری کی ذمہ داری میں تمہارے کندھوں پر ڈالتا ہوں میرے بھائی" ویر بھئی کے یہ الفاظ جو اس نے جاتے وقت کہے تھے اب بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔

چھ مہینے بعد ویر بھئی گھر آگیا۔ ان کے گھر میں بڑی دھوم دھام تھی۔ سبھی خوش تھے۔ راگھوی چاچی اور وینا خوشی سے پھولے نہیں سماتی تھیں۔ میں نے اپنے دوست کو دیکھ کر انتہائی مسرت محسوس کی۔ ویر بھئی تو

اپنے ساتھ بہت سارے کپڑے لایا تھا اپنی ماں کے لئے، اور وینا بہن کے لئے۔ ساڑھیاں، خوبصورت سینڈل، اور سونے کی چوڑیاں۔ اور بھی بہت سی گھریلو ضرورت کی چیزیں۔ پندرہ دن اپنے گھر میں قیام کے بعد ویر بھئی واپس اپنی ڈیوٹی پر روانہ ہو گیا۔ ہم تینوں، میں، ویر بھئی کی ماں اور اس کی بہن وینا۔ بس اڈّے تک ویر کے ساتھ گئے اور پھر ہم گھر لوٹ آئے۔

ایک دو مہینے کے بعد جب میں راگھوی چاچی کے سامنے سے گذرا تو اس نے مجھے بلا کر کہا ''بیٹے تم دن بھر کہاں ہوتے ہو، کہیں نوکری تو نہیں ملی ہے تمہیں؟ اور مجھے خبر تک نہیں!''

''نہیں چاچی!۔ نوکری ابھی میری تقدیر میں نہیں ہے۔ میں تو ہر روز یا تو فارم بھرتا اور درخواست دیتا رہتا ہوں دفتروں میں، یا کہیں انٹرویو دینے کے لئے جاتا ہوں''۔ میں نے چاچی کے سامنے وضاحت پیش کی۔

''بیٹا پچھلے ایک ہفتہ سے میں تمہارے ساتھ ایک اہم بات کرنا چاہتی تھی۔ بہت ہی ضروری بات'' چاچی نے کہا۔

''چاچی جی! کیا بات ہے؟ سب کچھ خیریت سے ہے نا؟'' میں نے چاچی سے جواب میں پوچھا۔

''بیٹے میں ویر اور تم میں کوئی فرق نہیں سمجھتی ہوں، تم دونوں کو میں اپنے ہی بیٹے سمجھتی ہوں۔ اور وینا تم دونوں کی بہن ہے۔ ہے نا بیٹے ایسا ہی؟'' چاچی نے عجیب انداز میں میرے طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

چاچی کی باتیں۔ پہیلیاں جیسی، میری سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ اسی لئے میں نے پھر سوال کیا۔ ”چاچی جی!“ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟ صاف صاف اور بغیر کسی جھجک کے کہہ دیجئے“۔

”بیٹا کیا بتاؤں اور کیسے بتاؤں؟۔ بتانا۔ اچھا ہوتا۔ تو کب کا بتا چکی ہوتی۔نہ چاہتے ہوئے بھی میں کہنے پر مجبور ہوں۔اس کے سوااور کوئی چارہ بھی نہیں ہے بیٹا!۔ تمہارے باپ نے ہمارے گھر پر بڑے بڑے احسان کئے ہیں۔ تم بھی ہم پر ایک بڑااحسان کر دیتے۔ تو میں اذیت ناک فکر اور غم سے نجات پاتی۔ کیا۔ کروگے ہم پر احسان۔ بیٹا!“ آج چاچی جی، بڑے ہی گھمبیر جذبات میں آکے نہ معلوم کیا کیا کہہ رہی تھی۔

میں نے پوچھا ”چاچی! تم نے خود ہی بتایا کہ ویر کی طرح میں بھی تمہارا بیٹا ہوں۔ تم بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے، میں وہ کام تمہاری خواہش کے مطابق انجام دوں گا“۔

”بیٹے! وینا ایک بہت ہی بڑی بے وقوفی کی حرکت کر گذری ہے۔ کسی ذلیل نے اس کو اپنے جھانسے میں پھنسا کر، اس کی زندگی سے ایک برا کھیل کھیلا ہے اور اب وینا کے پیٹ میں اس کا نتیجہ پل رہا ہے۔ بیٹا! تم ہم پر یہ احسان کرو۔ وینا کو ماہر ڈاکٹر کے پاس لے کر ہمیں اس بلا سے نجات دلا دے۔ ورنہ ہمارے گھر کی ویرانی ہوگی اور ہماری ناک کٹ جائیگی۔ اور ویر ۔وہ تو ذلت کے ڈر سے خودکشی کرے گا“۔ چاچی کی باتیں سن کر مجھ پر جیسے

ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

"چاچی! کون ہے وہ وحشی درندہ۔ جس نے معصوم وینا......" چاچی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا" بیٹا! یہ جان کر کیا کروگے۔ اس کا اب تو کچھ پتہ نہیں۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ بیٹا آج ہماری لاج رکھ لے"

میں اس رات سو ہی نہیں سکا۔ صرف کروٹیں بدلتا رہا۔ دوسرے دن مجھے ذرا آرام ملا۔ لیکن میرا ذہن عجیب و غریب الجھنوں میں مبتلا رہا۔ مجھے اس معاملے میں کیا کرنا چاہیئے؟ اور کون سا قدم اٹھانا چاہیئے؟۔ آج میری سوچ بھی میرا ساتھ دینے سے گھبرا رہی تھی۔ بہر حال۔ سب پریشان خیالوں کو سمیٹ کر میں نے آخر کار معاملہ کو حل کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

تیسرے دن صبح سویرے میں نے وینا کو اپنے ساتھ شہر کے ایک نرسنگ ہوم لے لیا۔ جہاں ماہر ڈاکٹر سے مشورہ کے تحت اس کا علاج کروایا۔ میں اسے بڑی خوش قسمتی سمجھتا تھا راگھوی چاچی اور وینا کے لئے کہ انہیں ایک بڑی مصیبت سے نجات مل گئی۔ خود میں نے اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کیا کہ میرے سر سے ذمہ داری کا بوجھ اتر گیا۔ دوسرے دن میں وینا کو نرسنگ ہوم سے لے کر اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہوا۔ جونہی میں بس اڈے پر بس سے اترا تو میرے ہوش اڑ گئے۔ پورا گاؤں شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ بہت سارے لوگ ہاتھوں میں لاٹھیاں لے کر آرہے تھے۔ ان لوگوں

نے ہم دونوں کو گھیرے میں لے لیا۔ اور مجھے بے تحاشا مارنا شروع کیا۔ گاؤں کے کسی شخص نے ہم دونوں کو شہر کے نرسنگ ہوم میں ڈاکٹر سے مشورہ کرتے دیکھتا تھا اور پورے گاؤں میں یہ افواہ اسی نے پھیلائی تھی کہ "میں نے وینا کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کئے تھے اور وہ میرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اسی لئے ہم دونوں اس پاپ کی نشانی کو ختم کرنے کے لئے نرسنگ ہوم گئے تھے"۔

میرا سر اور جسم لاٹھیوں کی بے تحاشا ضربوں سے لہو لہان کیا گیا وینا نے نزدیکی ندی میں کود کر اپنی آتم ہتھیا کرلی۔ گاؤں کا حال تو بہت ہی برا ہو گیا تھا، انسان درندہ بن گئے تھے۔ ہندو مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ مسلمان ہندوں کے دشمن بن گئے۔ شیطانی فطرت کے لوگوں نے انسانیت کی قبا کو تار تار کر کے رکھدیا۔ پورا گاؤں ایک ہولناک منظر پیش کر رہا تھا۔ میں ہاتھ پاؤں مار کے گاؤں سے بھاگ نکلا۔ بہت دور۔ اور پھر بہت ہی دور۔ ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے اس شہر میں۔ کسی سے مشورہ کئے اور بتائے بغیر ہی آیا تھا۔ اور اب گذشتہ پندرہ سال سے میں یہاں ایک اجنبی بن کر رہ رہا تھا۔ نہ کسی سے دوستی، نہ ہی دشمنی۔ دن بھر اپنا کام کاج ۔ اور رات کو اپنے ڈیرے پر۔ آرام سے پڑا رہنا۔ اپنے ماضی کو فراموشی کے اندھیروں میں دفن کر کے۔ لیکن۔

لیکن آج۔ پھر کوئی گھر سے اجڑ گیا ہے، شہر بدر ہو گیا ہے۔ کسی وینا

نے پھر خودکشی کی ہے۔ جب ہی تو شہر میں یہ تباہی مچی ہوئی ہے۔ مجھے پرانا۔
کڑوا ماضی پھر ستانے لگا۔ ع

یادِ ماضی عذاب ہے یارب

"لافانی اجالا"

بہتی ندی کے دونوں طرف دھان کے لہلہاتے کھیت تھے۔ موسم خزاں کی آمد تھی۔ شام کا دُھندلکا ہو رہا تھا۔ اور آسمان پر دور دور تک ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ساجد ندی کے کنارے خاموش بیٹھا خلاؤں میں نہ جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ آج اپنے معمول کے خلاف سنیچر وار کو بھی گاؤں میں ہی تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ ورنہ وہ ہر سنیچر وار کو اپنے آبائی شہر جایا کرتا تھا۔ میں چل ہی رہا تھا کہ اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر پریشانی اور افسردگی کے سائے تیر رہے تھے۔ میں نے اس کا نام پکار کر آواز دی، تو وہ اچانک جیسے، چونک پڑا، اور خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"ارے بھی ساجد! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم آج گم سُم اور پریشان سے کیوں دکھائی دیتے ہو؟" ساجد بالکل خاموش رہا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا، اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ آج اپنے گھر شہر میں کیوں نہیں گیا؟ تو اس نے ایک ٹھنڈی اور مایوسانہ آہ بھر کر کہا۔

''گھر میں میرا ہے ہی کون -جس کے پاس میں جاتا''

''ارے بھئی جس کے لئے ہر سنیچر کو جاتے تھے اسی کے لئے''

''نہیں دوست !اب میں وہاں نہیں جا سکتا۔اس کے اور میرے درمیان ایک بڑی ناقابل عبور دیوار کھڑی ہو گئی''۔یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر اسے میری طرف بڑھایا۔اور اِسے کھولنے کا اشارہ کیا۔میں نے لفافہ کھولا۔اس میں ایک خط تھا:۔

''ساجد!

دماغ میں خیالات کی بھرمار ہے۔میں یہ سوچنے سے بھی قاصر ہوں کہ کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔جو کچھ اور جس طرح سے لکھنا چاہتی ہوں وہ لکھ نہیں سکتی۔بس آپ کو اتنا بتاتی ہوں کہ کل منظور کے ساتھ میری منگنی ہو رہی ہے۔وہی منظور جس کے ساتھ آپ رہا کرتے تھے اور جو آپ کا قریبی دوست تھا۔سماج نے میرے اور آپ کے درمیان دیوار کھڑی کردی ہے میں اپنے والدین کے سامنے بے بس ہو چکی ہوں اور مجبور ہوں۔ہمت کر کے مجھے بھول جانے کی کوشش کرو، میں تو اس آگ کی تپش کو دھیرے دھیرے برداشت کر کے اپنی سوختہ سامانی کروں گی ہی۔

بدنصیب ...کہکشاں''

خط پڑھتے ہی ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔میں چوں کہ ساجد کا ہم راز

تھا، اسی لئے مجھے اس کی ہر بات کا بخوبی علم تھا۔ اس خط نے مجھے ساجد کی دو سال پہلے کی زندگی یاد دلائی۔ اس کے ماضی کی تصویریں میرے ذہن کے پردے پر ایک ایک کر کے اُبھرنے لگیں..........

ساجد ایک خوبصورت نوجوان تھا اور دو برس پہلے ہی ہمارے گاؤں کے ایگری کلچرل ڈیپارٹمنٹ کے اسٹور میں انچارج نگراں کے طور پر کام کرتا تھا۔ اس کے ذمہ مختلف قسم کی کھادوں اور بیجوں کی تقسیم کاری کا کام تھا۔ ساجد شہر کا رہنے والا ایک خوش پوشاک اور مہذب نوجوان تھا۔ اور اس نے بی اے تک تعلیم پائی تھی۔ حصول تعلیم کے دوران میں اس کا ایک اور ساتھی منظور بھی اسی کے ساتھ پڑھتا تھا۔ یہ دونوں دوستی کی زنجیر میں کڑیوں کی طرح جکڑے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ کوئی طاقت انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتی۔ وہ ایک جان دو قالب تھے۔

ساجد کا باپ ایک غریب آدمی تھا اور ایک تاجر کے پاس پرائیویٹ ملازمت کرتا تھا۔ بس اُللے تللے کر کے ہاتھ سے منہ تک کا گذارہ چلتا تھا۔

اور منظور ایک امیر ٹھیکیدار کا بیٹا تھا۔ اس کے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ ان کے گھر میں درجن بھر ملازم اور نوکر، موٹر، گاڑیاں، روز دعوتیں پکانا، بڑے بڑے آفیسروں سے میل جول، ان کا آنا جانا، سیر و تفریح کی تقریبیں منعقد کرنا، ۔وغیرہ۔ یہ سب معمول کی باتیں تھیں۔

ان دونوں کے ساتھ کلاس میں ایک امیر زادی کہکشاں بھی پڑھتی

تھی۔ ساجد دل و جان سے کہکشاں کو چاہتا تھا۔ اور اسے اپنی جیون ساتھی بنانے کا خواب بُن رہا تھا۔ کئی بار اس نے اپنے احساسات کو اظہار کی زبان دینے کی کوشش کی............ مگر...... وہ غربت کا مارا --- افلاس زدہ۔ احساس کمتری کا شکار تھا۔

ان دنوں وہ بی اے فائینل ایئر میں پڑھتا تھا، جب ایک روز کالج کی بس خراب ہو گئی تھی اور طالبات کی سواری کا کوئی دوسرا انتظام موجود نہ تھا۔ کہکشاں اکیلی سڑک کے بائیں کنارے چل رہی تھی۔ اور اتفاقاً ساجد بھی اس کے پیچھے ہی چل رہا تھا۔ راستے میں کہکشاں نے اچانک پیچھے مڑ کر ساجد کو دیکھا۔ ساجد کے ہوش وحواس گم ہوگئے اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ پسینہ سے شرابور ہو گیا۔ کہکشاں چند لمحے ٹھہری اور جونہی ساجد نزدیک آپہونچا تو وہ اس سے مخاطب ہوئی:۔

"ارے ساجد! کیا آپ نے پولیٹکل سائینس کے تمام نوٹس مکمل طور پر لکھ ڈالے ہیں؟"۔ ساجد نے خشک ہونٹوں کو زبان سے تر کرتے ہوئے کہا "ہاں! ہاں! میں نے تقریباً سارے ہی نوٹس لکھ ڈالے ہیں"۔

"تو پلیز! کل وہ نوٹس مجھے دیجیے، میں ممنون رہونگی، اور کاپی کرتے ہی انہیں واپس بھی کروں گی" کہکشاں نے ساجد کا پیشگی شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

دوسرے روز ساجد نے نوٹس لاکر کہکشاں کو دیدیئے۔ وہ نوٹس گھر لے گئی، اور ساجد کی خوش نویسی سے وہ بے حد متاثر ہوئی۔ اور اس نے

نوٹ بک کی ورق گردانی شروع کی۔ اسی دوران اس کی نظر نوٹ بک کے آخری صفحہ پر پڑی، جس پر ایک شعر لکھا ہوا تھا۔

نگاہوں نے دلوں میں ، دل نے آنکھوں میں تجھے

ڈھونڈا

ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو، برسوں

اس شعر نے کہکشاں پر جادو جیسا اثر کیا اور اس نے اپنے قلم کو اظہار کا اذن دے کر تحریر کیا۔

مجھے اور حالِ دل سے یہ تجاہل توبہ کر لے تو

کہ تجھ سے میری خاموشی نے کی ہے گفتگو برسوں

چند دنوں کے بعد کہکشاں نے نوٹ بک ساجد کو واپس کر دی، ان اشعار کے جوڑ کے ساتھ ہی دو دلوں کا جوڑ بھی ہونے لگا، اور قلمی دوستی بڑھتے بڑھتے قلبی دوستی میں بدل گئی۔ اب وہ دونوں کبھی کبھی ملتے اور باہم پہروں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے عہد و پیمان کیے۔ زندگی بھر ساتھ رہنے کی قسمیں کھائیں۔ محبت پروان چڑھتی رہی۔

بی اے کے فائینل ایر کے امتحان کا نتیجہ ابھی نکلنے والا ہی تھا کہ ساجد کا باپ کچھ دن کی علالت کے بعد ہی وفات پا گیا۔ اس طرح بے چارے ساجد کی دنیا تاریک اور ویران ہو گئی۔ اور اس کی زندگی کا سہارا۔ اس کا واحد

سرپرست، ہمدرد اور غم گسار باپ، بھی نہیں رہا۔ اس کی آخری امید بھی مایوسی کی نذر ہو گئی۔ وہ اب بھری دنیا میں اکیلا تھا۔ اس کے سامنے لاتعداد مسائل پہاڑ کی طرح کھڑے ہو گئے۔ پیٹ کے جہنم کو ایندھن مہیا کرنا تھا، تن ڈھانپنے کو کپڑا، چاہیئے تھا۔ گھر کے دیگر تمام اخراجات کو دیکھنا تھا، اب تو گھر اسے ڈسنے کو دوڑتے ہوئے لگتا تھا، بہر حال ابھی تو باپ کا اندوختہ تو کچھ کچھ موجود تھا، اور زندگی کی گاڑی کو وہ چلاتا رہا۔ امتحان کا نتیجہ نکلا، سب ہی پاس تھے۔ ساجد، کہکشاں اور منظور وغیرہ۔ ساجد ہر روز شام کو شہر کی پارک میں وقت گذاری کے لئے جاتا تھا اور کبھی کبھی اسے وہاں کہکشاں بھی ملتی تھی۔ اسے منظور بھی کبھی وہاں نظر آیا کرتا تھا۔ وہ اب کبھی کہکشاں سے ساجد کی غیر حاضری میں بھی ملتا تھا، کیوں کہ وہ پہلے ہی سے اس پر فریفتہ ہو چکا تھا۔ اسے وہ اکثر اپنی امیری اور دولت مندی کا احساس دلا کر، غریب ونادار ساجد سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

ساجد بیکاری سے تنگ آچکا تھا، لیکن آخر کار تقدیر اس پر مہربان ہو گئی اور اسے ایگریکلچر کے محکمے میں انچارج نگرانِ اسٹور کی ملازمت مل گئی اور پھر دور کے ایک گاؤں میں اس کی پوسٹنگ ہوئی۔ روزگار ملنے کے بعد اب ساجد کے دن پھر گئے، اس کی چستی اور توانائی پھر واپس آگئی۔ اب اسے صرف اپنے بُنے ہوئے خوابوں کو عمل میں لانے کی فکر دامن گیر رہنے لگی۔

دوسری طرف اب منظور کو وافر موقعہ ملا اور وہ بلا روک ٹوک کے

کہکشاں سے ملنے لگا، رفتہ رفتہ منظور اس کے قریب تر ہوتا گیا۔ اور دھیرے دھیرے ساجد کی محبت کے نقوش اس کی لوحِ دل سے محو ہونے لگے۔ دولت کی چمک دمک نے اپنا کام کر کے ہی دکھایا۔

دن بیتے -- مہینے بیتے اور سال بھی گذر گئے، اور آج -- آج کہکشاں نے ساجد کو یہ خط لکھا کہ اس کی منگنی منظور کے ساتھ ہونے والی تھی۔ اب اسے یقین ہو چکا تھا کہ ساجد اور اس کے درمیان حائل اس کی امیری کی دیوار کبھی گر نہیں سکتی ہے۔ اسی لئے اس نے (شاید) اب منظور کی شریکِ حیات بننا مان لیا تھا......

اپنی محبوبہ -- کہکشاں کی طرف سے آئے ہوئے اس خط نے ہی آج ساجد کے خوابوں کو چکنا چور کر کے اس کے دل کا سکون لوٹ لیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ زندگی سے بیزار سا لگ رہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر جب دوسری بار نظر ڈالی تو وہ اسی طرح گم سُم بیٹھا ہوا تھا اور بدستور خلاؤں میں تک رہا تھا۔ اس کے چہرے سے مایوسی اور غم گینی، ٹپکتی نظر آتی تھی۔ اور افسردگی اور پژمردگی کے مہیب سایوں نے اُسے آگھیرا تھا۔

میں نے اس کو چونکاتے ہوئے کہا "ساجد تمہیں ایک بار کہکشاں سے ضرور ملنا چاہیئے"۔

وہ چونک پڑا، اور بولا "کیوں بجھی ہوئی راکھ میں چنگاریاں ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہو؟۔ جو ہونا تھا --- وہ تو اب ہو چکا ہے"

"لیکن ساجد بھئی - پھر یہ افسردگی اور مایوسی......" میری بات قطع کرتے ہوئے وہ کہنے لگا "بھائی! میں مایوس، افسردہ اور غمگین کب ہوا ہوں۔ میں نے تو ہر وقت خوش رہنے کی کوشش کی ہے اور آج کا یہ غم بھی، میں برداشت کر رہی لوں گا۔ اگر کہکشاں میری نہ ہو سکی تو کیا ہوا۔ اس کی روح پرور یادیں تو میری رگ رگ میں سمائی ہوئی ہیں۔ میرے دل کے نہاں خانوں میں جب بھی غم کا اندھیرا شب خون مارنے کی کوشش کرے گا تو میں اس کی یادوں کے اجالوں سے انہیں روشن کروں گا۔ اس کا وجود میرے پاس نہ سہی -- اس کی محبت سے سرشار معصوم روح میرے ساتھ ہے۔ میں کہکشاں کو نہ پا سکا تو کیا ہوا۔ میں نے اس کا پیار تو حاصل کیا ہے۔ اس کا پیار تب تک میرے ساتھ رہے گا جب تک میرے وجود کے ساتھ سانسوں کا رشتہ باقی رہے گا"۔

جب ساجد یہ باتیں کہہ رہا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک عظیم عارف ہے اور اس کے چہرے پر سے یاس و حرماں کے چھائے ہوئے مہیب سائے ایک دم غائب ہو گئے اور ان کی جگہ امید و رجا اور پیار و محبت کے ان لافانی اجالوں نے لے لی --- جو روزِ ازل سے اہل عشق و محبت کے دلوں کو سرشار اور چہروں کو پر نور بنائے ہوئے ہیں۔

"خط"

گھر کے سب ہی لوگ خوش تھے، خصوصاً میری دونوں بہنیں اور ہمارا چھوٹا بھائی۔ اپنے نئے تعمیر کردہ مکان میں وارد ہونے کی شُبھ گھڑی کا ہم سب ہی بڑی شدت کے ساتھ انتظار کرتے آئے تھے۔ ہمارا پُرانا موروثی مکان بہت ہی خستہ حالت میں تھا، کچی اینٹوں کا، گھاس کی چھت اور قدیم وضع قطع کے دروازے اور کھڑکیاں، کمروں کی دیواروں پر مٹی کا پلاسٹر -- اور مٹی کی لپائی۔ برف کے موسم میں سردی سے بچنے کی خاطر ہی ہمارے بزرگوں نے اس کے طبقوں کی اونچائی مشکل ہی سے چھ فٹ فی منزل رکھی تھی۔ میرا خیال ہے کہ خالق کائنات نے ہمارا مکان مد نظر رکھ کر ہی ہمیں متوسط قد سے بھی کم قد عطا کیا ہوگا۔

ہم سب کی دلی خواہش تھی کہ ہمارا بھی ایک اچھا نیا مکان ہو، پکی اینٹوں کا، نئے ڈیزائن کا، بڑی بڑی کھڑکیاں شیشے لگائی ہوئی، اچھے خاصے دروازے، بڑی بڑی دہلیز، ہوادار کمرے، بالکل کشادہ، آہنی گرل لگی

سیڑھیاں خوبصورت بر آمدے۔ جن کے سامنے خوبصورت سبزے کی رَوِشوں میں رنگا برنگ پھولوں کے لان ہوں۔ غرض یہ سب کچھ۔ میری دونوں بہنوں کو بہت شوق تھا کہ ہمارا بھی اچھا خاصا قابل دید مکان ہو جہاں وہ اپنی سہیلیوں کو بلا سکیں۔ لیکن ہمارے ابوّ کی قلیل آمدنی میں ایسا بہت ہی مشکل تھا۔ زمین کا ایک پلاٹ تو ویسے ابو نے بہت پہلے اونے پونے داموں کسی سے خرید اتھا۔ لیکن یہ سب ویسے ہی دھرے کا دھرا رہ گیا۔

آج ہمارے ابو کو جنت الفردوس کا مکین بنے ہوئے پندرہ سال کا طویل عرصہ گذر چکا ہے۔ اور ہم اپنے نئے تعمیر کردہ مکان میں داخل ہو رہے ہیں۔ میری ملازمت کے سات سال کے بعد ہمارے گھر میں آج کے دن خاصی خوشی تھی۔ گھر کے سب ہی افراد پرانے مکان سے سامان ڈھونے میں مشغول تھے۔ ایک ایک چیز احتیاط کے ساتھ اٹھا کے لے جائی جا رہی تھی۔ میں بذات خود ابوّ کے پُرانے کاغذات، دستاویزیں، بہی کھاتے، کتابیں، فوٹو کاغذات کے پلندے، اور مختلف اشیاء کو غور سے دیکھ کر لے جا رہا تھا۔ میرے ہوش اس وقت اڑ گئے جب میں نے اپنے ابوّ کی ایک ڈائیری میں سے ایک پرانا خط پایا۔ جس کا مضمون اس عنوان سے تھا:۔

" برادر محترم خلیل صاحب

السلام علیکم

چونکہ میری صحت عرصہ سے سخت ناساز ہے، اور روز بروز گرتی ہی جارہی ہے، اب ڈاکٹروں نے کہاہے کہ میں کسی ایسے مرض میں مبتلا ہوچکا ہوں جس سے آسانی کے ساتھ چھٹکارا پانا مشکل ہے۔ میرا اپنا دل گواہی دے رہاہے کہ ہسپتال میں، میں اپنے آخری ایام گذار رہا ہوں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میرا اکلوتا فرزند، نذیر اپنے چچا کے پاس صاحب نگر میں ہے۔ وہ بیچارہ تو پہلے ہی ماں کے شفقت بھرے سایہ سے محروم ہوچکا ہے، اس کی عمر ہی ابھی کیا ہے۔ میں آپ کو اپنا جگری دوست ہمیشہ سے سمجھتا آیا ہوں اسی لئے میں آپ کے کندھوں پر ایک اہم ذمہ داری کا بوجھ ڈال رہا ہوں۔ اس امید اور یقین کے ساتھ کہ آپ یہ ذمہ داری اس طرح انجام دیں گے کہ مرنے کے بعد میری روح کو بے چینی اور قلق واضطراب سے نجات ملیگی۔

مہربانی کر کے میرے بیٹے نذیر کو اپنی سرپرستی میں رکھئے اس کی پرورش اور تعلیم وتربیت کا خاص خیال رکھئے۔ اس پر جو بھی اخراجات ہوں گے۔ اس کا میں نے پہلے ہی سے مناسب بندوبست اور انتظام کر رکھا ہے۔ آپ برائے کرم ہسپتال آکر مجھ سے ملیں، وہیں پر میں آپ کو اپنی جمع کردہ پونجی دے دوں گا۔ مجھے یقین واثق ہے کہ آپ میری التجا کو قبول کریں گے اور میری آخری خواہش کو خاطر خواہ طور پر پورا کریں گے تاکہ میرے اکلوتے فرزند کا مستقبل روشن بنے اور اسے کسی کے ہاتھوں کسی قسم کی

تکلیف اور زک نہ پہنچے۔ میں آپ کی آمد کے لئے چشم براہ رہوں گا۔

مورخہ ۲۸/ نومبر ۱۹۵۶ء

آپ کا اپنا دوست

بادشاہ خان

اسی خط کی پشت پر ابو کے ہاتھ سے یہ عبارت لکھی ہوئی تھی :۔ "مبلغ پچاس ہزار روپیہ جو میں نے اپنے دوست بادشاہ خان سے ہسپتال میں وصول کئے، آج ہی میں بینک میں امانت کے طور اپنے کھاتے میں جمع کر چکا ہوں۔ یہ رقم بادشاہ خان کی خواہش کے مطابق اس کے اکلوتے فرزند نذیر میاں کی پرورش اور تعلیم و تربیت وغیرہ پر صرف کرنی مقصود ہے۔ انشاء اللہ ایسا ہی کیا جائے گا۔

محمد خلیل

۲۹/ نومبر ۱۹۵۶ء"

میرے ابو کا انتقال پندرہ سال پہلے ۳/ دسمبر کو ہوا تھا۔ جب وہ گھر سے رخصت لے کر صاحب نگر کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں ان پر دل کا شدید دورہ پڑا اور وہ دوران سفر ہی انتقال کر گئے۔ کسی کو بھی اس بات کی کوئی واقفیت نہیں تھی کہ وہ اس روز کس کام کی انجام دہی کے لئے صاحب نگر کے سفر پر جا رہے تھے۔

اور آج مکمل پندرہ سال گذرنے کے بعد اس خط نے ساری باتیں۔

مجھ پر آشکارا کر دیں۔ ابو کی موت کے ایک سال بعد ہم نے بینک میں ان کے کھاتے میں جمع شدہ رقم میں سے ساٹھ ہزار روپے نکالے تھے اور اسی رقم کو پھر چھ سال کے میعادی ڈیپازٹ کھاتے میں جمع کیا تھا، جو رقم بڑھ کر -- سوا لاکھ روپیہ بن گیا تھا۔ یہی رقم ہم نے گذشتہ سال بینک سے وصول کر کے اپنا نیا مکان تعمیر کرنا شروع کیا تھا۔ اور آج ہمیں اسی بنائے ہوئے نئے مکان میں منتقل ہونا تھا۔

میرا ضمیر مجھے کوسنے لگا اور ملامت کرنے لگا، "ایک بے یار و مدد گار یتیم -- نذیر کی امانت کو ہم نے اپنی غرض کے لئے استعمال کیا۔ ہم نے اس کی ساری خوشیاں چھین لی ہیں۔ اس کے ممکنہ روشن مستقبل کو دائمی اندھیروں میں دفن کر دیا۔ نہ معلوم اس پر مصائب کے کتنے مہیب پہاڑ ٹوٹ پڑے ہوں گے اور اسے کن کٹھن رکاوٹوں اور تکلیفوں نے غربت کے دشوار گذار راستوں پر دھکیل دیا ہو گا۔ اور ہم ہیں -- کہ ہم نے محض اپنی خوشی کی خاطر ....

ہم خود غرض ہیں۔ لالچی ہیں۔ ہمیں اپنے آپ کو انسان کہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا ہے۔ مجھے ابھی صاحب نگر جا کر نذیر سے فوراً ملنا چاہئے اور اس سے معافی مانگ کر سب کچھ صاف صاف لفظوں میں بتا دینا چاہئے۔ یہ نیا مکان ہمارا نہیں ہے، اس کی امانت ہے۔ ہاں میں آج ہی اور ابھی نذیر میاں سے ملنے جاؤں گا"

صاحب نگر ہمارے گاؤں سے پچاس کلو میٹر کی دوری پر واقع ہے۔ میں شام ہونے کے بعد ہی رات کے اندھیرے میں، صاحب نگر پہنچ سکا۔ وہاں پہنچنے کے کچھ دیر بعد ہی میں نے نذیر میاں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کیا۔ پتہ چلا کہ نذیر کے والد بادشاہ خان کی موت کے بعد اس پر مصائب کا ایک لامتناہی سلسلہ آن پڑا۔ ایک ہی سال کے بعد اس کی چچی نے اسے اپنے گھر سے دھکے دے کر نکالدیا۔ اس کی پڑھائی چھوٹ گئی۔ اور وہ ساری خوشیوں اور مسرّتوں سے محروم ہو گیا۔ بھوک، محتاجی، تنگدستی اور افلاس و ادبار نے اسے گھیر لیا۔ اسے کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑے نہیں ملے۔ دربدر کی ٹھوکریں کھاتا ہوا وہ شہر کی ایک زیارت گاہ میں، فقیروں اور مسافروں کے ساتھ گذر بسر کرنے لگا۔ ہاتھ پھیلا کر بھی مشکل ہی سے دو وقت کی پیٹ بھر روٹی ملنی مشکل ہے۔ وہ دنیا سے متنفر ہوا تھا۔ اور اپنے آپ سے بھی بے زار ہوا تھا۔ دنیا میں اس کا کوئی ہمدرد، غم گسار، اور سرپرست نہیں تھا، نہ ہی اس کے حال زار پر کوئی آنسو بہانے والا یا ترس کھانے والا تھا۔ وہ بھکاریوں کے ساتھ رہ کر بھکاری بن گیا تھا۔ اور بھیک مانگ کر ہی اپنا پیٹ جیسے تیسے کر کے بھر لیتا تھا۔

نذیر میاں کے یہ روح فرسا اور الم ناک حالات سن کر میں فرط ندامت سے شرمندہ ہو گیا۔ ملامت نے میرے ضمیر پر احساس کے ہتھوڑے مارنے شروع کئے۔ میں صبح سویرے ہی سے اس کی تلاش میں نکلا،

آخر کار میں اس مشہور زیارت گاہ میں پہنچ گیا۔ جہاں اس کے ملنے کا امکان تھا۔ وہاں پر پہنچ کر میں نے اللہ سے دعا مانگی کہ اے اللہ اس بزرگ کے طفیل میرے گناہ معاف فرما اور مجھے نذیر سے ایک بار ملا دے۔ وہاں زیارت گاہ پر ہی معلوم ہوا کہ نذیر کئی دن سخت بیمار تھا اور اب نزدیک کے سرکاری ہسپتال میں زیر علاج ہے۔ دن ڈھلنے کو تھا جب میں ہسپتال کے اندر داخل ہوا۔ وہاں سے اسٹریچر پر سفید کپڑا اوڑھے ہوئے ایک مردہ کو ہسپتال سے باہر لے جایا جا رہا تھا۔

"ارے بھئی! یہ کس مریض کی لاش ہے؟" میں نے ایک آدمی سے پوچھا۔

"یہ کسی لاوارث بھکاری کی لاش ہے، جو زیارت گاہ پر بھیک مانگ کر گذر بسر کرتا تھا۔ اور کئی دنوں سے سخت بیمار تھا۔ بے چارہ کون لے گا اس کی لاش کو؟۔ اب اسے لاوارث مردوں کے قبرستان میں دفنایا جائے گا"

اس آدمی نے میرے پوچھنے پر ایک ہی سانس میں ہمدردی کے لہجے میں بتایا۔

"اور ہاں صاحب! آپ بھی پانچ دس روپئے۔ خدا کے نام پر اس کے کفن دفن کے لئے دید یجئے"

پیچھے سے دوسرے آدمی نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا "ارے بھئی! اس بے چارے کے کفن دفن کے لئے کسی سے مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں

ہے۔اس غریب کی جیب سے پچاس روپیئے برآمد کیے گئے وہی اس کے کفن دفن کے لیے کافی ہیں"۔

میں ہاتھ میں خط لیے دیکھ رہا تھا۔

''سپنا''

اکتوبر کا مہینہ تھااور موسم ابھی خوش گوار تھا' لیکن چناروں کے پتے کہیں کہیں سرخ ہوئے تھے اور پت جھڑ کی آمد آمد کا اعلان کر رہے تھے۔ دیر سے پکنے والے میووں اور پھلوں سے درخت لدے ہوئے تھے۔ ہوا میں ٹھنڈک آئی تھی۔ ایک خنک سی صبح تھی اور چھٹی کا دن تھا۔ گھر میں ابھی کوئی بھی بستر سے نہیں اُٹھا تھا۔ کسی کو ڈیوٹی پر جانے کی جلدی تھی نہ ہی بچوں کو اسکول جانے کی فکر تھی ۔نہ جانے میں کیوں آج پوری رات بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ میں بہت سویرے سے سورج کے طلوع ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر سورج کی کرنیں دیکھتے ہی، میں اللّے تللّے کر کے آہستہ آہستہ بستر سے اُٹھا تاکہ تمنؔا نیند سے جاگنے نہ پائے۔ اُسے بستر میں چھوڑ کر میں کمرے سے باہر نکل کر برآمدے میں آگیا۔ اور وہاں سے اخبار اُٹھایا اور شہ سُرخیاں پڑھنے کے بعد، پھر اس کے صفحے اُلٹنے لگا۔ بیچ کے صفحے پر جونہی میری نظر پڑی تو میں مبہوت ہو کر اسے دیکھتا ہی رہا۔ مجھ پر افسردگی کا عجیب عالم طاری ہو گیا ۔اخبار کے اس صفحے کے نیچے درمیان میں کالے حاشیئے میں سپنؔا کی تصویر تھی جس کے نیچے اُس کے مرنے کی خبر اس طرح لکھی ہوئی تھی ''نوجوان قلمکار

سپنا کی ناگہانی موت" مجھے محسوس ہوا کہ میرا سارا وجود تھر تھر کانپ رہا ہے اور میں گرنے ہی والا ہوں۔ میں نے اسی عالم میں برآمدے میں موجود ایک کرسی کو جلدی سے پکڑا اور اس پر اپنے وجود کے تھر تھراتے ہوئے بوجھ کو ڈال دیا۔ ماضی کی یادیں اب میرے ذہن اور دماغ کو کریدنے لگیں، ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں پُر اسرار دھند لکوں میں کھو گیا

پانچ سال پہلے میرا تبادلہ کلکتہ ہوا تھا، یہ شہر اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بہت بڑا شہر، نہایت ہی وسیع اور بہت ہی گنجان آبادی والا، جہاں ہر روز لکھو کھا لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، ہر طرف اور ہر بازار میں اپنے خوبصورت مدو جزر کے ساتھ رواں دواں ہے۔ اس لق و دق شہر میں تقریباً نصف سے زیادہ آبادی ان لوگوں کی ہے جو کلکتہ کے مضافات سے، کاروبار، نوکری، اور تعلیم و تربیت کے سلسلے میں آتے رہتے ہیں۔ ہمارا دفتر بھی اسی گنجان آباد شہر کے نسبتاً کم گنجان علاقے میں واقع تھا۔ یہاں بہت سارے فلیٹ تھے جن میں اکثر باہر کے لوگ ہی کرایہ دے کے رہا کرتے تھے۔ میرا فلیٹ بھی اسی علاقے کی ایک لمبی گلی میں تھا۔ گلیاں تو اس سارے علاقے کی بالکل ایک جیسی تھیں کیونکہ کہیں بھی کسی گلی کے سرے پر یا اندر میں غیر بنگالیوں کے لئے کوئی ایسا نشان نہیں تھا کہ وہ دوسری گلی سے مختلف محسوس ہو۔ ہاں بنگالی زبان میں اور اِکّے دُکّے ہندی میں بھی لکھی ہوئی چھوٹی چھوٹی تختیاں، گلیوں کے نزدیک لٹکی ہوئی ضرور نظر آتی تھیں۔ مگر اپنی بے بسی۔ کہ ہم بنگالی تو کیا، ہندی بھی نہیں جانتے۔

زبان شہر من ترکی و من ترکی نمی دانم

ہم تو صرف اردو اور انگریزی ہی جانتے تھے۔ اس لئے اکثر جگہوں پر مشکلات سے دو چار ہونا ہی پڑتا تھا۔

ایک روز دفتر میں بہت ہی اَبنارمل کام کی وجہ سے رکا رہنا پڑا، اور اس لئے مجھے دفتر سے بڑی دیر کے بعد فراغت ملی، اور وہاں سے اپنے فلیٹ تک پہنچنے میں بھی بہت وقت لگا، ہُوا یہ کہ میں فلیٹوں کے جنگل میں کھو گیا، ہر گلی ایک جیسی اور ہر فلیٹ یکساں۔ بہت وقت تک میں اِن لمبی لمبی گلیوں کی خاک چھانتا رہا اور اسی میں شام کا وقت بھی گذر گیا۔ تھک ہار کر بجلی کے ایک کھمبے کا سہارا لیتے ہوئے رُکا اور فلیٹ کی شناخت کی سوچ میں گم ہو گیا۔ اتنے میں کہیں سے ایک سُریلی نسوانی آواز آئی۔ "سر کیا بات ہے؟ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" پیچھے مُڑ کر میں نے دیکھا کہ بائیں پچیس سال کی ایک لڑکی بڑی سنجیدگی اور پُر وقار انداز کے ساتھ آہستہ آہستہ میری طرف آ رہی ہے۔ "میں..... میں یہاں گلی نمبر "اِے" کے فلیٹ نمبر سات میں رہتا ہوں، مگر میں وہاں جانے کا راستہ ہی بھول گیا ہوں۔ میں تو اس شہر میں بالکل نیا نیا ہی آیا ہوں۔ اسی لئے..."

"سر" اس لڑکی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "مجھے پتہ ہے کہ آپ پچھلے ہی ویک اِس شہر میں آئے ہیں اور آپ مین روڈ کے اُس پار آفس میں ایک جونیئر آفیسر ہیں"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا ہے؟" میں نے اس لڑکی سے پوچھا،

"سر۔ میں آپ کے آفس آتی رہتی ہوں اور آپ کی کسٹمر (Customer) بھی ہوں۔ اس لئے کہ آپ کے آفس کی سروِس بہت

اچھی ہے، میں نے آپ کو وہیں دیکھا ہے۔"

"اچھا سر! آپ تو اپنے فلیٹ کے بالکل پاس میں پہنچ گئے ہیں، دائیں گلی کا دوسرا فلیٹ آپ کا ہے۔ چلئے میں آپ کو وہاں تک چھوڑ آتی ہوں" اس کے ساتھ ہی یہ نوجوان لڑکی مجھے میرے فلیٹ تک لاکر واپس چلی گئی، میں تو اِس کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکا۔

دوسرے دن جب میں اپنے آفس کیبن میں بیٹھا تھا اور کوئی فائیل دیکھ ہی رہا تھا کہ کیبن کا دروازہ کھلا اور اندر یہی لڑکی داخل ہو گئی۔ میں نے فائیل بند کر کے اس کا سواگت کیا اور اس کے لئے چائے منگوائی، اس نے پہلے تو پینے سے معذوری ظاہر کی، میرے بار بار کہنے پر اُس نے چائے پی ہی لی۔

"کل تو میں آپ کا شکریہ ادا کرنا ہی بھول گیا۔ اگر آپ اس وقت وہاں نہیں ہوتیں تو پتہ نہیں میں اور کب تک اُس بھول بھلیاں میں کھویا رہتا۔ اور ہاں میں نے تو آپ کا شبھ نام بھی آپ سے نہیں پوچھا۔"

"سر! میرا نام سپنا ہے اور میں کلکتہ سے دور ایک گاؤں کی باسی ہوں۔ یہاں ایک میگزین کے لئے کام کرتی ہوں اور جن علاقے میں آپ کا فلیٹ ہے، وہیں آس پاس ہی میں، میں ایک ورکنگ گرلز ہوسٹل میں رہتی ہوں۔ گھر میں میرے پتاجی، اور میری چھوٹی بہن اور بھائی ہیں۔ ماتا جی تو پہلے ہی سورگ کو سدھاری ہیں۔ اچھا سر! اب میں چلتی ہوں" سپنا یہ کہکر میرے کیبن سے باہر نکلی

یہ لڑکی جس نے اپنا نام سپنا بتایا، شکل و صورت سے کافی ماڈرن اور بات چیت سے کافی تہذیب یافتہ معلوم ہوتی تھی۔ اور بہت ہی بے تکلف اور

غیر مصنوعی، ہنس مکھ اور مِلنسار بھی۔اس کے بعد جب بھی ہمارے آفس میں آتی تو وہ مُجھ سے بھی ضرور ملتی۔ اِنہی اتفاقی ملاقاتوں کی وجہ سے میں اس کے گھر اور خاندان کے بارے میں بہت کچھ جان گیا تھا۔ لیکن خود وہ بالکل ہی عجیب بے نیاز لڑکی تھی۔اس نے میرے بارے میں کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی۔ اور میں نے بھی اُسے اپنے بارے میں خواہ مخواہ طور پر کُچھ معلومات بتانے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ہمارا اپنا گھر بہت بھرا پُرا تھا جہاں میرے والدین، چاچا، چچّی، تین بھائی دو بہنیں، تین چچیری بہنیں، اور دو چچیرے بھائی، سب مشترکہ کُنبہ میں رہتے تھے۔ گھر میں ہمیشہ شور ُوغُل رہتا تھا۔ بڑوں کا رعب، چھوٹوں کا رونا چلّانا روز کا معمول تھا۔ حال ہی میں میری شادی سُویِٹی سے ہوئی تھی۔ سویِٹی تو اچھی خاصی خوبصورت لڑکی تھی۔ دل سے بہت اچھی اور نیک مگر مزاج کی اتنی ہی تند و تیز ۔ذرا سی بات پر غُصیلی بن جاتی تھی۔

میری شادی کے آٹھ ماہ بعد ہی جب میرا تبادلہ کلکتہ ہوا تو سویِٹی کو بہت دُکھ ہوا۔ میں بھی اتنی جلدی میں اُس سے الگ نہیں رہنا چاہتا تھا۔اور اس کو اپنے ساتھ کلکتہ لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن ہمارے گھر کے قواعد اور ضوابط کڑے قسم کے تھے۔ وہ بہو کو بیٹے کے ساتھ جانے پر کسی بھی صورت میں روادار نہیں ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ماں سے جب میں نے سویِٹی کو اپنے ساتھ لینے کی بات کی تھی تو اس نے دوٹوک الفاظ میں کہا تھا کہ ”بہو کا گھر اُس کا سسُرال ہے اور وہ بھی تو یہاں سرکاری نوکری کر رہی ہے۔ مرد تو روزی روٹی کمانے کہیں دور بھی چلے جائیں تو مناسب ہے۔ لیکن عورتوں کو اُن کے

ساتھ جانے کی کیا ضرورت ہے اور پھر ہمارے گھر میں آج تک ایسی بات کبھی بھی نہیں ہوئی ہے اور نہ ہی آئندہ ہوگی۔ آج سویٹی تمہارے ساتھ جائیگی تو کل تمہاری بڑی بھابھی بھی اپنے شوہر کے ساتھ کہیں اور چلی جائیگی۔ تمہارا بڑا چچیرا بھائی تو امریکہ میں ہے۔ لیکن زرینہ، اس کی بیوی تو یہیں اپنے گھر میں ہے اور وہاں کبھی بھی نہیں گئی۔" ماں کی ان باتوں کا جواب میں نہیں دے سکا۔

مجھے اب کلکتہ شہر میں رہتے ہوئے چار مہینے گذر گئے۔ ایک دن میں اپنے آفس میں حسب عادت بیٹھا ہوا تھا، اور نہ جانے کن خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ سپنا دروازہ کھول کر تیزی کے ساتھ اندر آگئی۔ اور آتے ہی مجھے کل اپنے جنم دن کی تقریب میں شامل ہونے کی دعوت دے کر چلی گئی۔ اتفاق سے یہ چھٹی کا بھی دن تھا۔ میں نے غنیمت جانا کہ فلیٹ میں بیکار پڑے پڑے رہنے سے دعوت میں شریک ہونا ہی اچھا رہیگا۔ اس طرح سے چھٹی کا دن اچھی طرح سے گذرے گا۔

دوسرے دن میں صبح ہی سے سپنا کے جنم دن کی تقریب میں شرکت کرنے کے لئے تیاری میں لگ گیا، میں نے باقاعدہ سوٹ پہن لیا اور فلیٹ کے دروازے میں تالا لگا کر، نکل گیا۔ چلتے ہوئے سوچنے لگا کہ سپنا کے لئے کوئی گفٹ لے لوں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا اور کونسا گفٹ لے لوں۔ اور ساتھ ہی اِس شش و پنج میں پڑ گیا کہ لینا بھی چاہیئے کہ نہیں، کیوں کہ مجھے اس طرح کی پارٹیوں اور تقریبات میں شامل ہونے کا کبھی موقعہ بھی نہیں ملا تھا۔ آخر کار بغیر کوئی گفٹ لئے میں تقریب میں شامل ہو گیا۔

ایک بڑے سے کمرے کے وسط میں جسے اچھی طرح سے سجایا گیا تھا۔

ایک بڑا ٹیبل تھا جس پر ایک بڑے سائز کا کیک رکھا ہوا تھا۔ ٹیبل کے دونوں بلکہ چاروں طرف کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ جن پر میرے سمیت کوئی بیس پچیس مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد تقریب کی عزت افزائی کے لئے سب مہمانوں نے کھڑا ہو کر سامنے رکھا ہوا بڑا کیک کاٹا اور ٹمٹما تی ہوئی موم بتیاں گل کر دی گئیں۔ سبھی نے تالیاں بجائیں اور مہمان ایک ایک کر کے سپنا کو مبارک باد دینے آگے بڑھے۔ سب کے ہاتھوں میں بیگ تھے جن میں کوئی نہ کوئی تحفہ تھا، میں اکیلا اس بھری محفل میں بغیر کوئی گفٹ لئے شامل ہوا تھا، ایک عجیب جھینپ کے ساتھ آنکھیں نیچے کئے ہوئے میں نے سپنا کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کے جنم دن پر آپ کو لاکھوں مبارک باد۔ میں کوئی تحفہ تو نہیں لا سکا۔ بس میں اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے آپ کو بہت بہت شبھ کامنائیں بھینٹ کرتا ہوں۔" سپنا کو میرا مبارکبادی کا یہ سیدھا سادہ، بے لوث اور بے تکلّف انداز بہت ہی پسند آیا۔ اور اس نے مجھے دیگر تمام مہمانوں سے خصوصی مہمان کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ تقریب بڑے ہی پر لطف انداز کی رہی، اور شام ہونے سے پہلے ختم ہو گئی۔

جولائی کے ابتدائی دن تھے۔ کہ شہر میں پیلیا کی بیماری پھوٹ پڑی تھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے میں بھی کسی بے احتیاطی کی وجہ سے اس بیماری کا شکار ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مکمل پرہیز کے ساتھ ساتھ خصوصی احتیاط اور آرام کا مشورہ دیا۔ اِس وجہ سے میں کئی روز آفس نہیں جا سکا۔ ایک روز میرے کمرے کے باہر کی گھنٹی بجی تو میں نے بستر سے گھنٹی بجانے والے کو اندر آنے

کیلئے کہا، دروازہ کھول کر سپناؔ اندر داخل ہو گئی۔ ''سر! میں نے آپ کا آفس میں پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ آپ کئی روز سے بیمار ہیں۔ اور ڈیوٹی پر بھی نہیں آئے ہیں۔ آپ تو بہت ہی کمزور ہو گئے ہیں۔ آپ کی حالت تو بالکل عجیب نظر آتی ہے۔ کُچھ کھاتے پیتے بھی ہیں آپ۔ یا نہیں؟۔ سر! یہ کلکتہ ہے یہاں کوئی کسی کو پوچھتا بھی نہیں۔'' سپناؔ کہے جا رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ میں فوراً بول اُٹھا'' سپناؔ آپ کی انسانیت نواز ہمدردی کے لئے میں آپ کا شکر گذار ہوں، اس بے انتہا پُر ہجوم شہر میں ہر ایک اجنبی ہے، یہاں کسی کو کسی سے کیا شکایت اور کیسے شکوے۔ رہی بات میری۔ میں تو کُچھ دنوں میں ٹھیک ہو ہی جاؤں گا۔ ہاں ڈاکٹر صاحب نے آرام کرنے اور احتیاط سے پرہیز وغیرہ کا مشورہ دیا ہے، اسی لئے میں آفس نہیں گیا۔'' ٹھیک اُسی روز سے لے کر اُس وقت تک مسلسل طور پر سپناؔ میری تیمار داری کرتی رہی جب تک میں صحت یاب نہ ہو گیا۔ ہر روز صبح اور شام میرے تمام کام انجام دینا اس کا معمول رہا، اور اس طرح سے اس نے اپنی انسان دوستی اور عظمت کا سکّہ میرے دل پر بٹھا دیا۔

صحت یاب ہو کر میں اپنے آفس میں ڈیوٹی انجام دینے لگا، ایک روز میں نے فیصلہ کیا کہ میں سپناؔ کو ایک اسپیشل پارٹی دیدوں، اس سلسلے میں، میں س کے لئے ایک خوب صورت شال بھی لایا۔ اتوار کو میں نے پورا انتظام کیا اور سپناؔ کو ڈنر پر بُلایا، سپناؔ آئی اور نہایت ہی خوش دکھائی دے رہی تھی۔ مُجھے اس سے پہلے اس کے چہرے پر خوشی کی سرخی اس طرح سے نظر نہیں آئی، جیسے کہ آج محسوس ہو رہی تھی۔

کُچھ ادھر اُدھر کی بات کرنے کے بعد ہم نے ڈنر کھانا شروع کیا، ہم ڈنر کو ختم کرنے والے ہی تھے تو باہر کی گھنٹی بج اُٹھی، میں نے دروازہ کھولا تو ۔"سویٹی! تُم اس وقت؟" میں نے قدرے بدحواسی کے عالم میں سویٹی سے پوچھا۔ وہ اندر آئی اور جونہی اس کی نظر اپنی جیسی ایک ہم عمر لڑکی سپنا پر پڑی تو اس کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا۔ میں نے دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔ اس کے ردّ عمل میں سویٹی نے اپنا مختصر سا سامان ایک طرف رکھتے ہوئے کہا "میں کوئی ان پڑھ گنوار نہیں ہوں کہ کُچھ نہ سمجھوں۔" سپنا حالات کی نزاکت محسوس کر کے ہم سے رخصت لیکر چلی گئی۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے ہوا کے ایک جھونکے نے اس کی عارضی خوشی کو دائمی اُداسی میں تبدیل کیا ۔وہ آج زیادہ خوش تھی لیکن اُوپر والے کو یہ منظور نہیں تھا کہ سپنا زیادہ دیر تک خوشی اور مسرّت بھرے لمحوں کے سپنوں میں محو رہے۔

سویٹی کا ہفتہ بھر کا ایک ٹرینگ پروگرام کلکتہ میں تھا، اسی سلسلے میں وہ آئی تھی اور صرف دو تین دن پہلے اُسے کلکتہ کے پروگرام کے بارے میں جان کاری ملی تھی، اسی لئے وہ مجھے کوئی اطلاع نہیں دے پائی تھی۔ یہاں آکر وہ دن کو تو اپنے ٹرینگ کالج جاتی رہی اور شام کو جب بھی فلیٹ پر آتی تو اس کا چہرہ عجیب قسم کی تلخی لئے ہوئے ہوتا تھا۔ میں نے اُسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہم کے بھوت نے اس پر قبضہ جمایا تھا، وہ کچھ سُننے کے لئے تیار نہیں تھی۔ ہفتہ بھر کے ٹرینگ پروگرام کے بعد سویٹی واپس چلی گئی۔

ڈنر کے واقعہ کے بعد سے سپنا کبھی بھی میرے کیبن میں نہیں آئی ہمارے آفس میں تو آتی رہی لیکن مُجھ سے ملے بغیر ہی چلی جاتی۔ ایک معمولی

بات کی وجہ سے نہ صرف سپنا جیسی پر خلوص اور بے لوث انسان بلکہ میں بھی زبردست ذہنی پریشانی کا شکار ہو گیا۔ اسی دوران مجھے پندرہ دن کی چھٹی ملی اور میں گھر آ گیا۔ یہاں مجھے معلوم ہوا کہ سویٹی نے ورکنگ گرلز ہوسٹل میں جا کر سپنا کو بہت بُرا بھلا کہہ کر، اُس پر بھانت بھانت کے الزام لگا کے اُسے سارے ہوسٹل میں بے عزت اور ذلیل کیا تھا اور اُسے زبردست وارننگ دی تھی کہ "اگر اسی طرح میرے شوہر سے آئندہ رنگ رلیاں منانے کی کوئی کوشش کی یا اُس سے ملنے کی ہمت کی تو مُجھ سے بُرا کوئی نہیں ہو گا۔" اِس غیر متوقع زبردست بے عزتی ہونے کے بعد سپنا بہت روئی تھی۔

چھٹیاں تو بہت ہی پھُس پھُسے انداز میں گذارنے کے بعد جب میں کلکتہ واپس پہنچ گیا تو میں نے سپنا سے ملنے کی کافی کوشش کی، میں کئی بار ورکنگ گرلز ہوسٹل میں اُس سے بات چیت کرنے گیا، لیکن وہ وہاں کبھی بھی نہ ملی، تھی تو وہ وہیں ہوسٹل ہی میں، مگر وہ مُجھ سے ہمیشہ دور رہنے کی کوشش کرتی رہی۔ اسی اثناء میں اچانک غیر متوقع طور پر کلکتہ سے میرے واپس ٹرانسفر کا آرڈر پہنچ گیا۔ یہ میرے لئے بالکل خلافِ توقع تھا کیوں کہ ابھی کلکتہ میں میری ملازمت کی ٹرم پوری نہیں ہوئی تھی۔ لیکن سویٹی نے اپنے والد صاحب کا اثر و رسوخ استعمال کر کے میری تبدیلی کا آرڈر جاری کروایا۔

اپنے آفس سے ری لیو (Relieve) یعنی فارغ ہو کے اور چارج دے کے رخصت ہو گیا تو میں سیدھے سپنا کے ہوسٹل چلا گیا۔ وہاں باہر کے گیٹ کے قریب کھڑا رہا جوں ہی سپنا اپنے آفس سے واپس ہوسٹل کے گیٹ کی طرف چلنے لگی تو میں نے اُسے روک کر کہا "سپنا! میرا یہاں سے ٹرانسفر ہو گیا

ہے اور کل ہی میں چار بجے کی ٹرین سے واپس جا رہا ہوں۔ میں آپ سے رخصت لینے آیا ہوں۔ میں اور کچھ کہنا نہیں چاہتا ہوں۔ مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ لیکن میری طرف سے، آپ سے معافی مانگنے کا وقت ختم ہو چکا ہے
"

....

سپنا کی آنکھوں سے آنسو کے دو بڑے بڑے بوند ٹپک پڑے اُس نے مجھ پر ایک عجیب نظر ڈالی اور بغیر کچھ کہے، ہوسٹل کے اندر داخل ہو گئی۔

میں اپنے اسٹاف کے دیگر ممبران کے ساتھ ، جو مجھے الوداع کہنے کے لئے میرے ساتھ تھے، تیس منٹ پہلے ہی ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ ٹرین جوں ہی پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی، میں ٹرین میں داخل ہو گیا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اسٹاف کے ممبران میرا سامان ٹرین کے اندر لائے اور اب وہ باہر نکل کر کھڑکی کے نزدیک آکر مجھ سے الوداع کہہ کے ہاتھ ملا رہے تھے۔ ٹرین اب چلنے والی ہی تھی کہ ایک دھیمی آواز سے میرے کان چونک پڑے۔ "سر" سپنا میرے دائیں طرف ٹرین کے اندر کھڑی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک گل دستہ تھا۔ خلوص اور مہر و وفا اور تہذیب اور شائستگی کا مُجسّمہ۔ سپنا، مغموم اور اُداس۔ میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے گل دستہ میری طرف بڑھایا اور ہچکیاں لینے لگی، اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمنڈ پڑا، میں بھی اپنے آنسو نہیں رُوک سکا۔ سپنا نے رومال سے اپنے آنسو پونچھے اور ٹرین کے چلنے کی سیٹی سنکر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ٹرین نے رفتار پکڑی، اور میں گلدستہ کو اپنے سینے سے لگائے رہا۔ نہ جانے میری نظر گلدستہ کے ساتھ لگی پرچی پر کس طرح سے پڑی، "سر! میرا آپ کے ساتھ ویسے تو کوئی دُنیاوی رشتہ نہیں۔ لیکن

میری زندگی میں سب سے قریب آپ ہی رہے۔ میں یہی سمجھی ہوں کہ سپنا کو
آپ ایک سپنے ہی کی طرح ملے تھے۔"

"اجنبی بھائی"

اب تورانی کی شادی کی تقریب کی تاریخ نزدیک آرہی تھی اور اس میں چند دن ہی باقی رہ گئے تھے۔ شادی کے سلسلے میں سب ضروری کام اور امورات مکمل ہوچکے تھے، ساری تیاریاں کی گئیں تھیں، دورونزدیک کے تمام رشتہ داروں کو دعوت نامے بھی بھیج دیئے گئے تھے۔ لیکن ابھی تک رانی کا باپ جسپال سنگھ گھر نہیں پہنچا تھا، جس کا بڑی بے چینی کے ساتھ سب ہی لوگ انتظار کر رہے تھے۔ جب کہ طے شُدہ پروگرام کے مطابق اُسے رانی کی شادی سے ایک ہفتہ پہلے ہی گھر آنا تھا۔ مگر خدا جانے وہ ابھی کیوں آنے نہیں پایا تھا۔ جسپال سنگھ فوج میں صوبیدار میجر کی رینک کا آفیسر تھا اور سرحد کے نزدیک ایک گاؤں میں اپنی کمپنی کے ایک یونٹ کے ساتھ ڈیوٹی پر مامور تھا۔ گاؤں اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں پچھلے کئی برسوں سے شورش چل رہی تھی۔ جسمیں بہت سے لوگوں کے ساتھ ساتھ سپاہی اور شورش کرنے والے بھی مارے گئے تھے۔ اس علاقے میں مُتعین فوجیوں کو بڑی مُشکل سے ہی اسپیشل قسم کی چھٹی ملتی تھی۔ لیکن جسپال سنگھ نے اپنی اکلوتی اور چہیتی بیٹی رانی

کی شادی کے موقعہ پر دو مہینے کی اسپیشل چُھٹی کے لئے پہلے ہی درخواست دیدی تھی۔ گھر میں سب لوگ جسپال سنگھ کے وقت پر نہ پہنچنے کی وجہ سے بہت ہی فکر مند اور پریشان تھے۔ اور اُس کی بیٹی رانی۔ تو بالکل گُم سُم اور بے جان گڑیا کی طرح نظر آتی تھی۔ وہ غم کی وجہ سے اندر ہی اندر میں گھلی جارہی تھی۔ اڑوس پڑوس کے لوگ بھی اُداس ہی دکھائی دیتے تھے اور مختلف قسم کے خیالات، اور خدشات میں مُبتلا تھے۔ کیوں کہ پچھلے ہی مہینے گاؤں میں صوبیدار ہرپال سنگھ کی لاش پہنچی تھی وہ بھی جسپال سنگھ کے ساتھ ہی اُسی شورِش زدہ علاقے میں اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا اور ایک اِن کاؤنٹر (مُقابلہ) میں مارا گیا تھا، اس روز سارے گھروں کے چولھے بُجھ گئے تھے۔ سار گاؤں اس کی موت پر ماتم کر رہا تھا، اور ابھی گاؤں والے اس واقعہ کو بھولے نہیں تھے۔ اسی لئے وہ تشویش اور الجھن میں مُبتلا نہ معلوم کن کن خدشات میں دم بخود تھے کہ جسپال کیوں نہیں آرہا ہے، جبکہ اُسے بہت پہلے آنا تھا۔

رات کا پُر ہول سناٹا سارے ماحول پہ چھایا ہوا تھا، سارا گاؤں بالکل خاموش اور سُنسان لگ رہا تھا، ہر طرف گھپ اندھیرا تھا، اگرچہ گاؤں کے تقریباً سب ہی گھر سو چکے تھے، کہیں کہیں دور و نزدیک ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں دکھائی دیتی تھیں۔ جسپال سنگھ کے گھر کے لوگ اور وہاں پر آئے ہوئے رشتہ دار، اور چند پڑوسی، ابھی بیٹھے جاگ رہے تھے۔ اتنے میں دور سے کسی کے چلنے کی آہٹ صاف سُنائی دینے لگی، سب کے کان کھڑے ہوگئے اور دھیرے دھیرے بوجھل قدم اٹھانے کی آواز کی طرف دھیان رکھتے ہوئے باہر گئے

سڑک پر نکل آئے۔ اب یہ آواز بالکل نزدیک سے سنائی دینے لگی۔ ہر ایک کی نظریں آنے والے کی طرف لگ گئیں۔ دلوں کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں کچھ تو لالٹین ہاتھ میں لئے ہوئے تھے، کسی نے بڑی جلدی سے ٹارچ ہاتھ میں لے لی اور آگے بڑھ کر آنے والے شخص پر روشنی ڈال دی، تھکا ماندہ ٹوٹا ہوا، تھکاوٹ سے چور، ایک ہاتھ میں بڑی اٹیچی اور دوسرے ہاتھ میں ایک موٹا سا بیگ لئے یہ جسپال سنگھ ہی بڑے بوجھل قدموں کے ساتھ آرہا تھا۔ عجیب سا شور اُٹھا اور سب لوگ باہر نکل کر آگے بڑھے اور جسپال سنگھ سے پُر تپاک طریقے سے گلے ملے۔ ہر ایک کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو اُمنڈ پڑے۔ رانی دوڑتے دوڑتے اپنے پتا جی سے مل کر خوشی سے پھولے نہ سمائی۔ سب لوگ بہت ہی خوش ہوگئے اور گھر میں گویا شادی کی تقریب ابھی سے شروع ہوگئی۔ جسپال کی آمد پر سب نے بھگوان کا شُکر ادا کیا رانی کے بعد سب سے زیادہ خوش جسپال کی بیوی تھی۔ جو اپنے حواس ہی کھو چکے تھی اب وہ خوشی سے چہکنے لگی۔

رانی کی شادی کی تیاریاں جو مدھم پڑگئی تھیں اب پُر مسرّت ماحول میں ہونے لگیں مکان کو بجلی کے قمقموں سے سجایا گیا۔ ہر طرف چہل پہل کا سماں شروع ہوگیا۔ رانی، جسے مایوں بٹھایا گیا تھا، کو اب نہلا، کے سنوارا گیا۔ اس کے دائیں بائیں اس کی ہم جولیوں، سہیلیوں اور چھوٹی بڑی بچّیوں کی بھیڑ لگ گئی۔۔ دعوت پر آئی ہوئی رشتہ دار عورتوں کے ساتھ ساتھ اڑوس پڑوس کی عورتیں بھی اس خوشی کے موقعہ پر گائے جانے والے گیت گانے میں شامل

ہو گئیں۔ کُچھ دیر کے بعد دعوت پر آئے ہوئے مہمانوں کو پُر تکلّف پکوان کھلایا گیا۔ ماہر عورتوں نے اب دلہن رانی کو خاص انتظام کے ساتھ سنوارا، کیوں کہ کچھ دیر بعد ہی دُلہا اپنی برات لے کر آنے والا تھا۔

جسپال سنگھ جو نہایت ہی خوش و خُرم دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے چند قریب ترین رشتہ داروں کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوا، جہاں اُس کی بیٹی رانی دُلہن کو بٹھایا گیا تھا۔ جسپال سنگھ نے سب کے سامنے ایک بند تھیلا رانی بیٹی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا "بیٹی رانی۔ یہ بند تھیلا صرف آپ کے لئے ہے، لے اور اسے کھول کر دیکھ لے" کمرے میں موجود سب ہی مرد اور عورتیں بڑے ہی اشتیاق کے ساتھ خاموشی سے دیکھنے لگے۔ رانی نے تھیلا کھولا اور دیکھا کہ اس میں ایک عُمدہ اور بہت ہی قیمتی شال ہے جس کے ساتھ کاغذ کی ایک پرچی پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی "ایک اجنبی بھائی کی طرف سے اجنبی بہن کو۔ اُس کی شادی کے مبارک دن پر پیار و محبّت اور خلوص بھرا تحفہ" رانی نے اپنے پِتا جی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو جسپال سنگھ بول اُٹھا۔ "بیٹی اس کے بارے میں، میں تمہیں تفصیل کے ساتھ سب کچھ بتادوں گا ، لیکن تمہاری شادی سے فراغت پانے کے بعد۔"

رانی کی شادی بڑے دھوم دھام سے ہوئی۔ لیکن رانی اپنے پِتا جی سے وہ بات جاننا چاہتی تھی جس کے بارے میں اُسے ابھی تک کچھ بھی نہیں بتایا گیا تھا۔ شادی کے بعد دوسرے مہینے میں رانی اپنے شوہر کے ساتھ میکے آئی، کیوں کہ اب اُس کے پِتا جی کی چھُٹی ختم ہونے والی ہی تھی۔ اس لئے رانی اپنے شوہر

کے ساتھ، اپنے پِتا جسپال سنگھ کا آشیرواد لینے کے ساتھ ساتھ اُسے وداع کہنے بھی آئی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد جب سب لوگ باتوں میں مگن تھے۔ رانی نے اپنے پِتا جی سے ''اَجنبی بھائی کے تحفہ'' کے بارے میں پوچھا۔

جسپال سنگھ نے اِدھر اُدھر نظر دوڑاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''پیاری رانی بیٹی! تمہیں تو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ میری ڈیوٹی ایک بہت ہی خطرناک شورش زدہ علاقے میں ہے۔ جہاں آٹھوں پہر موت ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہوتی ہے۔ ہر روز نہ معلوم کتنے شورش پسند لوگ اور سپاہی مارے جاتے ہیں یا زخمی ہوتے ہیں۔ تمہاری شادی پر آنے کے لئے جس دن سے میری منظور ہوئی چُھٹی شروع ہونے والی تھی اُس سے صرف ایک ہی دن پہلے میں دور ایک بستی میں اپنی ڈیوٹی پر لگا تھا لیکن میرے دل اور دماغ پر صرف تمہاری شادی کی فکر چھائی ہوئی تھی۔ اتنے میں ایک دم کہیں سے دھماکے کی خطرناک آواز آئی اور ہر طرف دھواں ہی دھواں اُٹھنے لگا۔ میں نے گلی کے ایک طرف جانے کی جو کوشش کی تو دیکھا کہ مجھے دونوں طرف سے شورش پسند مُسلّح آدمیوں نے گھیرے میں لے لیا ہے۔ ان کے پاس کافی ہتھیار بھی تھے۔ وہ مجھے دور کسی نامعلوم جگہ لے گئے اور وہاں وہ مجھ سے لاتعداد سولات پوچھنے لگے۔ میں نے اُن کے سامنے بہت ہی منّت سماجت سے اپنی بات کہنے کی بار بار کوشش کی، لیکن وہ تو میری ایک بات بھی سُننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ تھک ہار کر میں جان گیا کہ میری آخری گھڑی آ پہنچی ہے۔ کیوں کہ جس کسی سپاہی کو وہ لوگ پکڑ کے لے جاتے تھے۔ اُسے وہ زندہ نہیں چھوڑتے تھے۔ اس

حالت میں جب میرے دل میں تمہارا خیال آگیا۔ تو میری آنکھوں سے آنسوؤں کی نہ تھمنے والی بارش شروع ہو گئی۔ میں بہت زیادہ رویا اور اپنے آپ پر کوئی قابو نہیں رکھ سکا۔ جس مکان میں، وہ لوگ مجھ سے پوچھ تاچھ کر رہے تھے، اس کے مالک کا بیٹا بھی وہیں پر تھا اور اُن مُسلّح آدمیوں پر اس کا اچھا خاصا اثر ورسوخ اور رعب نظر آتا تھا۔ اس نوجوان شخص (مالک مکان کے بیٹے) نے جب میرا اس طرح سے رونا، اور افسردگی دیکھی تو پوچھا "کیا بات ہے کہ تم ایک فوجی ہو کر بھی اتنا زبردست رو رہے ہو؟" تو میں نے اُس سے مخاطب ہو کر کہا "بیٹے مجھے مرنے کا غم ہے نہ اس طرح قید ہونے کا۔ پریشانی ہے تو اپنی اکلوتی اولاد۔ یعنی بیٹی۔ جس کی شادی بالکل اسی ہفتے میں ہو رہی ہے۔ اگر میں وہاں نہیں پہنچ سکا تو اُس کے ہاتھ پیلے کون کرے گا۔ وہ میرا راستہ تک رہی ہو گی۔ مجھے کل سے دو ماہ کی چُھٹی پر صرف اسی لئے جانا ہے تاکہ میں اپنی بیٹی کی شادی کر سکوں، چُھٹی کے بارے میں مُومنٹ آرڈر بھی آج ہی مجھے مل گیا ہے ۔ آپ بھی اِسے دیکھ سکتے ہیں۔"

"سچائی پر مبنی میری باتوں نے ان تمام شورش پسند جوانوں پر عجیب ہی اثر ڈالا، مجھے محسوس ہوا کہ اُن کے تیور بدل گئے۔ نوجوان شخص کچھ دیر کے لئے اپنے ساتھیوں سمیت دوسرے کمرے میں چلا گیا اور کچھ دیر کے بعد واپس آیا، اس وقفے کے دوران مجھے چائے بھی پلائی گئی۔ کوئی پون گھنٹہ کے بعد میرے ہاتھ میں ایک تھیلا دیا گیا اور یہ کہہ کر مجھے واپس اُسی گلی میں لایا گیا جہاں سے، مجھے پکڑا گیا تھا۔ "اے فوجی انکل! یہ تھیلا اپنی پیاری اور اکلوتی بیٹی کو دیدینا

۔اور خود نہیں کھولنا"

یہ ساری عجیب و غریب اور دہشت سے بھری خوشی کی کہانی سُنکر رانی حیران رہ گئی۔ "پتاجی! کیا اُس اجنبی بھائی کو ہم لوگ دیکھ سکتے ہیں کبھی۔؟" رانی بیٹی، میرا من بھی یہی چاہتا ہے اور میں خود بھی ایک بار پھر اُس سے ملنا چاہتا ہوں لیکن حالات ایسے نہیں ہیں۔ پھر بھی دیکھا جائے گا، میں اب اسی ہفتے واپس اپنی ڈیوٹی پر جارہا ہوں۔ میں کسی طریقے سے اس کے بارے میں مُفصّل جان کاری حاصل کروں گا۔"

"پتاجی۔ اگر وہ آپ کو مل گیا کہیں تو اس اجنبی بھائی کو اجنبی بہن کا سلام کہدینا۔ اُس نے نہ صرف تمہیں نئی زندگی دی ہے، بلکہ ہم سب کو مسرّتوں سے مالامال کر دیا ہے۔ اور خصوصی طور پر مجھے برباد ہونے سے بچایا وہ تو ہمارے لئے ایک دیوتا ثابت ہُوا! بھگوان اس کا ہمیشہ بھلا کرے" رانی نے جذبات بھرے لہجے میں کہا۔

چھٹیاں ختم ہوتے ہی جسپال سنگھ اپنے گھر کے لوگوں سے رُخصت لے کر واپس ڈیوٹی پر آگیا۔ کمپنی کے سب ہی لوگوں نے اُسے بیٹی کی شادی انجام دینے پر مبارک باد دی۔ اس کے بعد وہ حسب سابق مختلف جگہوں پر اپنی ڈیوٹی دیتا رہا۔

ایک دن صبح کے وقت وہ اپنی بارک سے باہر نکل کر گراونڈ میں چل ہی رہا تھا کہ باہر والے گیٹ سے ایک تیز رفتار فوجی ایمبولنس گاڑی اندر داخل ہوئی اور کسی شدید زخمی شخص کو اسٹریچر پر اُٹھا کر سپاہی ہسپتال کے اندر لے گئے

۔ لیکن کچھ دیر کے بعد اس شخص کی لاش ہسپتال سے باہر لائی گئی۔

جسپال سنگھ نے ایک سپاہی سے پوچھا، "بھئی کیا بات ہے، یہ کس کی لاش ہے؟" تو فوجی نے کہا کہ "یہ ایک بڑے ہی خطرناک شورش پسند کی لاش ہے جسے آج صبح سویرے ہماری یونٹ کے جوانوں نے ایک بھیڑ میں شدید زخمی کر کے پکڑ لیا۔ یہ بڑا ہی خونی اور درندہ تھا۔ آج ہمارا پورا یونٹ خوش ہے کہ اتنی بڑی کامیابی ملی ہے۔" جسپال سنگھ نے بھی اس سپاہی سے ہاتھ ملا کر خوشی کا اظہار کیا۔ اور لاش کی طرف آگے بڑھا۔ اس نے جونہی لاش کے چہرے سے پردہ اٹھا کر دیکھ لیا........

"اجنبی بھائی"۔ جسپال سنگھ سے رہا نہ گیا، اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اور وہ ایک طرف ہو لیا۔